

پرویز، ڈاکٹر قمر زمان، محمد شیخ، بابر چودھری، قاضی کفایت اللہ  
اور ان جیسے دیگر لوگوں کے نام

# قرآن سے دشمنی نہ کیجئے قرآن کو قرآن کے کہے کے مطابق سمجھئے

ڈاکٹر مفتی عبدالواحد  
...çaY (änþ, Ú äÄÚ^q ð^j ÊY]...]

قرآن سوسائٹی  
...çaY Jæ... pæ]... Ö...^µ Üm†ò änþ, Ú äÄÚ^q

## گزارش

بسم اللہ حامداً و مصلیاً۔ پرویز سے تو ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا اگرچہ پرویز کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ لاہور کے قاضی کفایت اللہ اور ڈاکٹر قمر زمان سے ملاقات بھی ہوئی اور ان کی کتابیں بھی پڑھیں اور کراچی کے محمد شیخ سے بھی ملاقات ہوئی اور ان کی آڈیو پر چند تقریریں سنیں۔ کراچی ہی کے ایک بابر چودھری ہیں جن کے بارے میں محمد شیخ کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ یہ اور ان جیسے بعض اور لوگ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن پاک کی صحیح خدمت کرنے کے بجائے صرف اپنے خود تراشیدہ افکار کی خاطر قرآن کو Exploit یعنی اس کا استحصال کر رہے ہیں۔

محض ہمدردی و خیر خواہی کی خاطر ہم نے فہم قرآن سے متعلق چند حقائق حوالہ قرطاس کر دیئے ہیں۔ اس مکتبہ فکر کے حضرات سے بھی اور دیگر عوام و خواص سے بھی ہماری گزارش ہے کہ زیر نظر کتابچہ کو ضد اور تعصب سے بالا ہو کر پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائیں اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنادیں۔ آمین۔

عبدالواحد

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ لاہور

ربیع الثانی 1425

## فہرست مضامین

- 4 پہلا باب: علم حاصل کرنے کا قرآنی طریقہ
- 7 بیان قرآن منجانب اللہ ہے
- 7 بیان الہی کی حقیقت
- 13 قرآن کی اور اس کے بیان کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ رکھی ہے
- 18 دوسرا باب: قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کی ضرورت کی چند مثالیں
- 18 پہلی مثال
- 19 دوسری مثال
- تیسرا باب: قرآن کے کہے کے مطابق قرآن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہونے والی
- 21 بھیا نک غلطیاں
- 21 پہلی غلطی..... صلوٰۃ کی تعداد پانچ نہ ماننا
- 24 دوسری غلطی..... صلوٰۃ کی قرآنی حقیقت کو بگاڑنا
- 32 تیسری غلطی..... جنات کا انکار کرنا
- 37 چوتھی غلطی..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ماننا
- 40 پانچویں غلطی..... ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو قرآن سے ثابت کرنا
- 47 چھٹی غلطی..... حضرت آدم کی متعین ہستی ہونے کا انکار کرنا
- ساتویں غلطی..... ملائکہ کا ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہونے کا
- 48 انکار کرنا
- آٹھویں غلطی... ابلیس کا موجود فی الخارج ہستی ہونے کا انکار کرنا 53

## پہلا باب

# علم حاصل کرنے کا قرآنی طریقہ

کسی بھی علم کو حاصل کرنے کے لئے اس علم و فن کے ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے پڑتے ہیں مثلاً ڈاکٹر قمر زمان ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ طب کی تعلیم انہوں نے ماہرین طب سے حاصل کی اور یونیورسٹی سے اس کی سند لی پھر دنیا نے ان کو ڈاکٹری کرنے کے قابل سمجھا۔

اب عقل تو یہ کہتی ہے کہ کوئی بھی علم اس کے ماہرین کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور قرآن بھی کہتا ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (رسول لوگوں کو کتاب و حکمت سکھاتے ہیں)۔ جس کے مطابق صحابہؓ کو قرآن سیکھنے کی ضرورت تھی اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں سکھانا شامل تھا حالانکہ صحابہؓ تو عام طور سے ان احوال سے واقف تھے جن میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ جب صحابہؓ نے قرآن رسول اللہ ﷺ سے سیکھا تو بعد والوں کے لئے لازم تھا کہ وہ اہل علم صحابہؓ سے سیکھتے اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا اور فی الواقع ہوا بھی ایسے ہی۔

لیکن قرآن پاک اور عقل کے اس ضابطہ کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے کچھ حضرات یہ ہدایت دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے شروع ہونے والے مذکورہ علمی اور تعلیمی سلسلہ کی کوئی ضرورت نہیں اور اللہ تعالیٰ خود قرآن پڑھنے والے پر معافی و مفاہیم واضح کرتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر زمان لکھتے ہیں۔

”ہر ہر شخص قرآن کو شروع سے آخر تک کھول کر پڑھ لے خود ہی ساری بات سمجھ جائے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی انگلی پکڑ کر ہر ہر نکتہ کو سمجھاتے جائیں گے اور معافی و مفاہیم واضح کرتے

جائیں گے۔“

محمد شیخ کہتے ہیں:

”قرآن میں ہے: اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْكِتٰبَانَ۔ رحمان (اس نے) علم دیا قرآن کا۔ اسی نے تو انسان کو خلق کیا ہے اور اس کو بیان کرنے کا علم دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں اور ہمارے بارے میں Relationship بتائی (یعنی تعلق بتایا) لہذا اگر ہم اللہ پر توکل کریں اور اس کو پڑھنے کی کوشش کریں تو یہ اللہ کا Claim (دعویٰ) ہے کہ اگر آپ قرآن کو جاننا چاہیں تو اللہ علم دیتا ہے۔“

اسی وجہ سے محمد شیخ کہتے ہیں کہ محمد شیخ (یعنی خود ان) کو قرآن اللہ نے سکھایا ہے۔

نیز وہ کہتے ہیں:

قرآن میں ہے: لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُحْجَلَ بِهِ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ فَاِذَا قَرَأْتَهُ فَاسْتَعِزْ قُرْاٰنَهُ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ یعنی کسی بھی پڑھنے والے کو اللہ کہتا ہے کہ قرآن جلدی جلدی مت پڑھو۔ ہمارے اوپر ہے اس کو جمع کرنا اور پڑھانا۔ پس جب ہم اسے پڑھیں تم اس پڑھائی کی اتباع کرو پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا بیان کرنا۔“

اس آیت کا حاصل نکالتے ہوئے محمد شیخ کہتے ہیں ہم میں سے ہر پڑھنے والے کو

i- اللہ پڑھاتے ہیں۔

ii- اللہ علم دیتے ہیں۔

iii- بیان بھی اللہ ہی سکھاتے ہیں۔ (القرآن القرآن کے بارے میں کیا کہتا ہے)

ہم کہتے ہیں

ڈاکٹر قمر زمان اور محمد شیخ کی بات قرآن اور عقل دونوں ہی کے خلاف ہے۔

قرآن پاک میں وعظ و نصیحت بھی ہے اور دیگر مضامین بھی ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت پر تفصیلی کلام ہے۔ اور رد شرک پر خوب زور ہے۔ اخلاق حسنہ کے بارے میں گفتگو ہے۔ ان مضامین کو حسب ضرورت مثالوں سے بھی سمجھایا اور سابقہ امتوں کے واقعات کو ان کے لئے دلیل بنایا۔ یہ مضامین سب خاص و عام کی ضرورت ہیں۔ اس لئے ان مضامین کے

..... اعتبار سے قرآن پاک کو آسان فرمایا اور آیات کو واضح کیا اور ہر شخص کو دعوت دی کہ وہ ان مضامین میں غور کرے اور اگر نہیں کرتے تو کیا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں۔

ان مضامین کے علاوہ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور عقائد کی باریکیاں بھی ہیں اور احکام کے اصول و ضوابط بھی ہیں۔ ان باتوں کو کا حقہ سمجھ لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ قرآن پاک میں قُرْوٰۃ کا لفظ آیا ہے جس کے عربی لغت میں حیض اور طہر دونوں ہی معنی ملتے ہیں۔ اب قرآن پاک میں اس لفظ سے کونسا معنی لیا جائے؟ کیا عام آدمی جس کو عربی ادب و لغت اور اصول دین سے واقفیت نہ ہو یہ کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح قرآن پاک میں ”کَلَّالَہ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے چند ایک معنی ہیں۔ اور تین معنی ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو مراد لیا جاسکتا ہے۔ اب ایک عام آدمی جس کو صرف قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنا آتا ہے وہ تین میں سے ایک معنی کی تعیین کس طرح کر سکے گا؟ نیز قرآن پاک میں ربوا اور سود کا ذکر ہے کہ یہ حرام ہے۔ اب یہ جاننا کہ ربوا کی کتنی شکلیں ہیں عام آدمی ان کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ قرآن پاک کے ایسے ہی مضامین جو کہ بذات خود بہت سے ہیں ان کو سمجھنے اور جاننے کے لئے حکم دیا کہ کچھ لوگ مستقل وقت نکال کر ان کو سیکھیں رسول اللہ ﷺ سے یا آپ کے شاگردوں سے یا شاگردوں کے شاگردوں سے آخر سلسلہ تک اور دوسروں کو سکھائیں۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ. (سورۃ توبہ 122) ترجمہ: سو کیوں نہ نکلا ہر ایک فرقہ میں سے ان کا حصہ تاکہ سمجھ حاصل کریں دین میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو (یعنی دین کے مسائل بتائیں) اور ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرائیں۔

## تعلیم کی نوعیت بیان قرآن اور تعلیم قرآن ہے۔

1۔ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ. (تاکہ آپ لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دیں کہ جو

ان کی طرف نازل کیا گیا)۔

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی یہ بتایا گیا کہ آپ ﷺ لوگوں کو نازل شدہ کھول کھول کر بیان کر دیں۔ آپ ﷺ کے اولین مخاطب یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم عام طور پر سے عربی زبان

.....

سے خوب واقف تھے بلکہ ان کی زبان ہی یہ تھی۔ اور قرآن پاک کا نزول عربی میں ہی ہوا اور ڈاکٹر قمر زمان صاحب اور محمد شیخ صاحب وغیرہ کے بقول اللہ تعالیٰ نے خود بیان سکھا دیا تھا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو پھر کس قسم کے بیان کی ضرورت ہوئی۔ بلا ضرورت بیان کرنا تو عیب ہے۔ جب ان کو بھی بیان کی ضرورت تھی تو بعد والوں کو اور ہمیں کیوں نہ ہوگی۔

2- يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ رَسُولُ اللَّهِ ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں)۔  
لوگوں پر تلاوت آیات سے قرآن کا پہنچانا ہو گیا۔ اس کے بعد کتاب و حکمت کی تعلیم جو رسول اللہ ﷺ صحابہ کو دیتے تھے وہ کتاب کو سمجھنے ہی کے لئے دیتے تھے۔ جب صحابہ کو تعلیم کتاب کی ضرورت تھی اور انہوں نے یہ عذر نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ تو ہماری انگلی پکڑ کر خود ہمیں قرآن سمجھا دیں گے تو دوسروں کو اس تعلیم سے بے نیازی کیونکر ہو سکتی ہے۔

## بیان قرآن منجانب اللہ ہے

قرآن پاک میں ہے

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (سورہ قیامہ)  
بے شک ہمارے ذمہ اس کو (یعنی قرآن کو آپ کے سینہ میں) جمع کرنا ہے اور پڑھنا ہے (آپ کی زبان سے) تو اس کے پڑھے جانے کی پیروی کیجئے پھر ہمارے (ہی) ذمہ اس کا بیان ہے۔

## بیان الہی کی حقیقت

بیان دو طریقے سے ہوتا ہے

پہلا طریقہ: جو بات کہی اس سے معنی و مقصود کھل کے سامنے آجائے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہ رہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا:

هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ (آل عمران 128) (یہ بیان ہے لوگوں کے واسطے)  
كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (سورہ بقرہ: 178) اسی طرح

اللہ کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی آیتوں کو لوگوں کے لئے

**تنبیہ:** ان الفاظ قرآنی میں آیاتہ سے پورے قرآن پاک کی آیات مراد ہوں اس پر کوئی دلیل نہیں۔ لہذا ان سے بعض آیات مراد ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات کو اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: پہلے کلام میں کہیں کچھ اجمال و ابہام ہو۔ اب نیا کلام لا کر اس اجمال کی تفصیل کر دی جائے اور ابہام کو دور کر دیا جائے۔ یہ دوسرا کلام بھی بیان کہلائے گا اس کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہے۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ. (سورہ قیامہ)  
 ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا (تیرے سینہ میں) اور پڑھنا (تیری زبان سے) پھر جب ہم پڑھنے لگیں (فرشتہ کی زبانی) تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے پھر بلاشبہ ہمارے ذمہ اس کا بیان ہے۔

اس آیت میں یہ بتا کر کہ قرآن کا بیان ہمارے ذمہ ہے واضح کیا کہ قرآن علیحدہ چیز ہے اور اس کا بیان علیحدہ چیز ہے جس کی صورت یہ ہے کہ قرآن پاک کے وہ مقامات جو خود پورے طور پر واضح نہیں ہیں مثلاً نماز کی صورت ہے، حج کی تفصیل ہے، فُرُوءٌ سے کیا مراد ہے اور تَکْلَافٌ کا کونسا معنی مراد ہے ان کا بیان بھی اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لیکن قرآن کے علاوہ میں۔ قرآن پاک نے ایسی کوئی تصریح نہیں کی کہ اس کی ہر بات کا بیان لازمی طور پر قرآن میں ہوگا۔

لَتَعْبِثَنَّ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ ترجمہ: (تاکہ آپ لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا)۔

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی یہ بتایا گیا کہ آپ ﷺ لوگوں کو نازل شدہ کھول کھول کر بیان کر دیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت قرآن کے ان ہی مقامات میں ہوگی جن کا تفصیلی بیان قرآن میں موجود نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بیان کے غیر کتاب میں ہونے کی وضاحت

وحی نبوت و رسالت کا خاصہ لازم ہے



.....  
 اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلَى نُوْحٍ وَالنَّبِيِّنَ مِنْ بَعْدِهِ وَ اَوْحَيْنَا اِلَى اِبْرٰهِيْمَ  
 وَاسْمٰعِيْلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيسٰى وَيُوْنُسَ وَ هٰارُونَ وَسَلٰيْمَانَ  
 وَ اٰتَيْنَا دَاوُدَ زُبُوْرًا. (نساء 235)

(اے نبی) بے شک ہم نے تیرے پاس ایسے ہی وحی بھیجی ہے جیسے نوح اور اس کے بعد  
 کے نبیوں کے پاس بھیجی ہے اور (جیسے) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور انبیاء بنی اسرائیل  
 کے پاس وحی بھیجی ہے اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کے پاس وحی بھیجی ہے اور داؤد کو  
 ہم نے زبور دی ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی بھی نبی ایسا نہیں ہوا جس کی طرف وحی نہ کی گئی ہو

**لیکن ہر وحی کتابی نہیں ہوتی**

1- مذکورہ بالا آیت بھی اس کی دلیل ہے کیونکہ سب ہی انبیاء علیہم السلام کو کتاب یا صحیفہ  
 نہیں دیئے گئے۔

2- يَا نُوْحُ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صٰلِحٍ (سورہ ہود، 46)  
 اے نوح وہ نہیں ہے تیرے گھر والوں میں۔ اس کے عمل خراب ہیں۔

جب طوفان نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہوا اور آپ علیہ السلام نے بارگاہ  
 الہی میں عرض پیش کی تو یہ جواب دیا گیا ظاہر ہے یہ کوئی کتابی وحی نہیں تھی۔  
 علاوہ ازیں حضرت نوح علیہ السلام کو کوئی کتاب یا صحیفہ ملنا ثابت نہیں۔

3- يَا لَوْ طُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنَ يُصَلُّوْا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ.

(سورہ ہود، 81)

اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے۔ وہ ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک سو نکال  
 لے جا اپنے لوگوں کو کچھ رات سے۔

یہ فرشتے تھے جو حضرت لوط علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام اور وحی لائے تھے کہ  
 آپ کی قوم پر عذاب آنے والا ہے اور آپ راتوں رات اپنے علاقے سے نکل جائیں۔ یہ بھی  
 کتابی وحی نہیں تھی اور حضرت لوط علیہ السلام کو کتاب یا صحیفہ ملنا بھی ثابت نہیں۔

.....

4- وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضُهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَاَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَاكَ هَذَا قَالَ نَبَاَنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ.

(سورہ تحریم 3)

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی بیوی سے ایک بات پھر جب اس نے خبر کر دی اس کی اور اللہ نے جتلا دی نبی کو تو جتلائی نبی نے اس میں سے کچھ اور تلا دی کچھ۔ پھر جب وہ جتلائی عورت کو بولی آپ کو کس نے بتلا دی یہ۔ کہا مجھ کو بتایا بڑے جاننے والے اور بڑی خبر رکھنے والے نے۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ذاتی معاملہ میں سے کوئی خاص بات ایک اہلیہ محترمہ سے خفیہ طور پر ارشاد فرمائی اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ کسی اور کو نہ بتانا۔ مگر وہ اہلیہ محترمہ ضعف بشری کی وجہ سے دوسری اہلیہ کو بتا بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو سارا قصہ معلوم کروا دیا۔ لیکن قصہ بتانے کی تفصیل قرآن پاک میں نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ کتاب و قرآن کے علاوہ وحی تھی۔

## غیر قرآنی یا غیر کتابی وحی احکام پر بھی مشتمل ہوتی ہے

1- مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَيْنَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ. (سورہ

حشر 5)

جو کاٹ ڈالتم نے کھجور کا درخت یا کھڑا رہنے دیا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے۔ بنو نضیر کے محاصرہ کے وقت مسلمانوں نے ان کے درخت کاٹے باغ اجاڑے تاکہ ایک تو وہ اپنا مالی نقصان ہوتا ہو دیکھ کر بند قلعہ سے باہر آئیں اور دوسرے کھلی جنگ میں درختوں کی رکاوٹ نہ رہے۔ دشمنوں نے اعتراض کیا کہ مسلمان خود تو فساد سے روکتے ہیں کیا درخت کاٹنا فساد نہیں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تصویب فرمائی کہ یہ ہمارے حکم سے ہوا۔ اور چونکہ یہ حکم قرآن پاک میں کہیں مذکور نہیں ہے اس لئے وہ قرآن کے علاوہ وحی تھی۔

2- يَا بَنِي إِدْرِي فِي الْمَنَامِ إِنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ قَالَ يَا آتِبِ الْفَعْلُ

(سورہ الصافات 102)

.....  
 کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تجھ کو ذبح کرتا ہوں پس دیکھ تیری کیا رائے ہے  
 بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جواب میں یہ کہنا اَفْعَلُ مَا تُؤْمَرُ (آپ کو جو حکم دیا گیا ہے  
 آپ کر گزریئے) اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حکم الہی تھا۔ اور یہ حکم الہی کتاب کے علاوہ خواب  
 کی صورت میں حاصل ہوا۔ لہذا یہ کتاب الہی کے علاوہ وحی تھی۔

غرض قرآن سے یہ ثابت ہوا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک کتابی اور دوسری غیر کتابی نیز یہ  
 بھی ثابت ہوا کہ غیر کتابی وحی تشریحی بھی ہوتی ہے یعنی احکام یا ان کے متعلقات پر مشتمل ہوتی  
 ہے۔

غیر کتابی باتیں جو اللہ تعالیٰ کسی کو عطا کریں قرآن اس کو حکمت کا نام

دیتا ہے

اگرچہ قرآن میں بھی حکمت موجود ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے  
 ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (سورہ اسراء: 39)  
 یہ ہے ان حکمت کی باتوں میں سے جو وحی کی آپ کی طرف آپ کے رب نے۔  
 لیکن خود قرآن پاک ہی سے معلوم ہوا کہ حکمت کتاب الہی کے علاوہ بھی ہوتی ہے کیونکہ  
 وہ غیر نبی کو بھی دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ اَتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (سورہ لقمان) اور ہم نے لقمان کو (جو  
 نبی نہ تھے) حکمت دی کہ شکر کر اللہ کا۔

يُوْنُسُ الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (سورہ

بقرہ: 269)

عطا کرتا ہے حکمت جس کسی کو چاہے اور جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی خیر دی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کو کتاب بھی ملی اور حکمت بھی ملی اور آپ دونوں کی

تعلیم و تبلیغ کرتے تھے

.....

يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ جمعہ 2)  
 رسول ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

وَإِذْ كُتِبَ لِلَّهِ أَلِفٌ عَلَيْهِمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ.  
 (سورہ بقرہ: 231)

اور یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے اور اس کو جو اتاری تم پر کتاب اور حکمت کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ۔

بہ میں جو ضمیر واحد غائب کی ہے اس سے لفظ ما مراد ہے جو لفظی اعتبار سے واحد ہے۔  
 اور الکتاب اور الحکمة اس ما کا بیان ہے اور چونکہ حرف عطف و او مغایرت کا معنی دیتا ہے  
 اس لئے مَا أَنْزَلَ دوجیزیں ہوئیں ایک کتاب اور دوسری حکمت۔

نبی کے اجتہاد کو بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل ہوتی ہے ورنہ بدل دیا جاتا ہے اس لئے نبی کا اجتہاد بھی وحی ہوتا ہے

رسول اللہ ﷺ نے جب جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں ان سے فدیہ لینے کا فیصلہ کیا تو عتاب یوں نازل ہوا

مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يُكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثَنِّنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَصَ الدُّنْيَا  
 وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ  
 عَذَابٌ عَظِيمٌ. فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ. (سورہ  
 انفال 70)

نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خون ریزی نہ کر لے ملک میں۔  
 تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت اور اللہ زور آور ہے حکمت والا ہے،  
 اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب۔ سو کھاؤ جو  
 تم کو غنیمت میں ملا حلال سہرا اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔

نبی کا اجتہاد بطور نبی کے ہوتا ہے عام مجتہد یا مرکزی اتھارٹی کے طور پر نہیں اوپر کی آیت میں فرمایا مَا كَانَ لِنبِيِّ عَنِیٰ نبی کو نہیں چاہئے تھا مطلب یہ ہے نبی کا اجتہاد عام مجتہد یا مرکزی اتھارٹی کے طور پر نہیں بلکہ نبی کے طور پر ہوتا ہے۔

جب وحی کتابی اور غیر کتابی دونوں طرح ہوتی ہے تو حکم ہوا کہ رسول کی بتائی ہر بات کو قبول کرو یہ نہیں کہ صرف کتابی کو لو اور غیر کتابی کو چھوڑ دو کیونکہ دین کے تمام قوانین کی تشکیل سے متعلق وہ ہر بات رسول کی حیثیت سے بتاتے ہیں محض حکمران کی حیثیت سے نہیں۔

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (سورہ حشر: 7)

(اور جو دے تم کو رسول لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو)

مَا کا لفظ عام ہے اور اس میں کتاب الہی اور اس کے نفاذ کی تمام تفصیلات شامل ہیں کیونکہ یہ دونوں ہی باتیں آپ ﷺ نے دی ہیں۔ اور خطاب بھی قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں سے ہے۔ یہاں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ فرمایا: مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ یعنی جو کچھ تمہیں رسول دیں۔ یعنی جو حکم اور تفصیل وہ تمہیں دے رہے ہیں رسول کی حیثیت سے دے رہے ہیں۔ اور مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (جس کام سے یہ تم کو روکیں تم رک جاؤ) یہ نبی اس بات پر قرینہ ہے کہ مَا آتَاكُمُ میں احکام اور اوامر بھی شامل ہیں۔

قرآن اور اس کے بیان خواہ وہ غیر کتابی ہو اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رکھی ہے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (سورہ حجر: 9)

ہم نے ہی ذکر (یعنی قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن پاک کا بیان جس کے بغیر قرآن پاک کے متعلقہ حصوں کو کما حقہ سمجھنا مشکل ہے اس کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض

منصی میں اس کو بیان کرنا شامل ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جنہوں نے قرآن پاک کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اس کے الفاظ کی حفاظت کے اسباب تو بتائیں لیکن اس کے بیان اور معانی کی حفاظت کے اسباب نہ بتائیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بھی اسباب بنائے اور رسول اللہ ﷺ کے کہے ہوئے الفاظ اور مضامین اور آپ ﷺ سے صادر شدہ اعمال و افعال جو کہ آپ ﷺ کا اسوہ مبارکہ تھا اور قرآن کا قوی و عملی بیان تھا ان کو محفوظ کرایا۔

### قرآن کا غیر کتابی بیان حدیثوں میں محفوظ ہے

ہم کہتے ہیں کہ قرآن کے مجمل اور مبہم مقامات کے بیان کا دوسرا نام حدیث ہے۔ جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے ذمے ہے کہ وہ قرآن کا بیان لائے ورنہ تو گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اب قرآن کے ان مقامات کو سمجھنا ممکن ہی نہیں کیونکہ قرآن کی رو سے قرآن کو فی الجملہ سمجھنے کے لئے اس کا بیان ضروری ہے جواب موجود نہیں لہذا قرآن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس سے خود قرآن پر اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر جو اعتراض پڑتا ہے اس کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

حدیث کی حفاظت ان لوگوں کے ذریعے کروائی جن کی تعریف خود

### قرآن نے کی

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ جیسے حضرات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کرائی۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیروکار ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہو ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے)۔

یہ صرف کتابی قسم کے لوگ نہیں تھے بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اسوہ مبارکہ کو اپنے اعمال و افعال میں اتارا۔ اسی کو اتباع کہتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر ان کی تعریف ہوئی۔ اور بعد والوں نے پہلوں کی اتباع کی اور اس پر قرآن پاک نے بعد والوں کی بھی تعریف کی۔ اس کے علاوہ ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے کہے ہوئے الفاظ اور مضامین کی حفاظت کے لئے

.....  
اپنی زندگیاں وقف کیں۔ آخر حضرات عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابو ہریرہ، انس، ابوسعید خدری، عبداللہ بن عباس، ابی بن کعب، معاذ، عبداللہ بن مسعود اور حضرت عائشہ و دیگر امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا اور کیا مشغلہ تھا۔ ان کی دنیوی مشغولیتیں کتنی تھیں یہ بھی ہمارے سامنے ہے اور دینی دلچسپی کتنی تھی یہ بھی کسی پر مخفی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ تو چند نمایاں مثالیں ہیں۔ دیگر صحابہ اور وفود جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے وہ آخر کیا کرتے تھے۔

پھر تابعین و تبع تابعین کے دور میں لاکھوں انسانوں کا علمی مشغلہ ہی قرآن و حدیث تھا۔ عربی بہت سوں کی اپنی زبان تھی۔ علوم عربیہ ابھی زیر تدوین تھے۔ فلسفہ وغیرہ نے لوگوں میں ابھی رواج نہیں پایا تھا۔ خالص علوم نبوی کی تحصیل یہی ان کا مشغلہ تھا اور اسی میں انہوں نے اپنی زندگیاں قربان کیں۔ تابعین کے دور میں مجاہد، علقمہ، نافع، حسن بصری، ابن سیرین، ابو حنیفہ، شعبی، ابراہیم نخعی، اسود، قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم، عکرمہ، سالم بن یسار، ابن شہاب زہری رحمہم اللہ محض چند مثالیں ہیں ورنہ تو تاریخ ان کے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ اور تبع تابعین میں امام مالک، ابو یوسف محمد، زفر، حسن بن زیاد، اوزاعی، معمر، عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید قطان، مکی بن ابراہیم اور حفص بن غیاث رحمہم اللہ ہیں۔ یہ بھی محض چند مثالیں ہیں جن پر ہم اختصار کی وجہ سے اکتفا کرتے ہیں ورنہ تو اس دور میں علم ہی یہی تھا اور اسی علم کا ہر جگہ چرچا اور رواج تھا۔

ان تین ادوار میں یعنی صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے ادوار میں احادیث کی جمع و تدوین مکمل تھی۔ صحابہ کے دور میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں احادیث لکھیں اور اس مجموعہ کا نام صادقہ تھا۔ اس میں پانچ ہزار سے زائد حدیثیں تھیں۔ اسی صحیفے سے بعد کے محدثین نے بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں۔ تابعین کے دور میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار لکھی جو انکے بہت سے شاگردوں نے نقل کی۔ اور سرکاری طور پر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور خلافت میں ابن شہاب زہری اور مکحول کو مامور کیا کہ وہ احادیث نبوی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال و افعال یعنی آثار کو جمع کر دیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔

.....  
تبع تابعین کے دور میں نمایاں شخصیت امام مالک کی ہے۔ جنہوں نے موطا امام مالک

لکھی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے موطا امام محمد لکھی۔ ان کے علاوہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں وجود میں آئیں۔ اور یہ سب کتابیں اب بھی عام دستیاب ہیں۔ غرض قرآن اور بیان قرآن (یعنی حدیث) کے تعلیم و تعلم کا ایک سلسلہ تھا جو رسول اللہ ﷺ سے شروع ہوا اور نسل در نسل بغیر کسی انقطاع کے چلتا رہا۔ یہ ایک ادارہ (Institution) تھا جس کی صحابہ کے دور میں کئی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔ ایک ایک اہل علم صحابی خود ایک مرکزی حیثیت رکھتے تھے اور علاقے والے ان کے پاس دین کا علم یعنی قرآن و حدیث سیکھنے آتے تھے۔ اور وہ تعلیم عملی Practical اور زبانی (Verbal) دونوں ہی قسموں پر مشتمل تھی۔

پھر ذرا سوچا جائے تو رسول اللہ ﷺ سے جو احادیث منقول ہیں وہ صرف ہزاروں میں ہیں۔ تو کیا اتنی احادیث کو یاد رکھنا امت کے لئے کوئی مشکل کام تھا۔ محض دنیوی رہنماؤں کے اقوال و احوال کی حفاظت کا تو میں کیا کچھ اہتمام نہیں کرتیں تو کیا محسن انسانیت اور افضل الرسل کے اقوال و افعال کو یاد رکھنے اور ان کو اپنانے سے یہ امت ایسی ہی عاجز تھی۔ حاشا وکلا ایسی بات متصور ہی نہیں اور ایسا تصور کرنا بہت غیر معقول بات ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ تو بہت بعد کے لوگ ہیں۔ ان کو تو جمع شدہ حدیثوں کے ذخیرے ملے ہیں۔ وہ ذخیرے انہوں نے اپنے مختلف اساتذہ سے حاصل کئے اور پھر حدیثوں کا ایک مختصر انتخاب کتابی شکل میں پیش کیا۔ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں امام اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھا وہاں ہمارے ساتھیوں میں سے کسی کی زبان سے نکلا ”کاش تم رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے بارے میں کوئی مختصری کتاب جمع کر دیتے“۔ خطاب تمام حاضرین مجلس سے تھا لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے اس کتاب کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے نام ہی میں انہوں نے وضاحت کر دی کہ انہوں نے اس میں تمام صحیح حدیثیں جمع نہیں کیں۔ بلکہ وہ صحیح حدیثوں کا ایک اختصار و انتخاب ہے اور نام یہ رکھا اَلْجَامِعُ الْمُسْنَدُ الصَّحِيحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ أُمُورِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَ سُنَنِهِ وَ أَيَّامِهِ۔

**تنبیہ:** ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے رطب و یابس کے مجموعوں سے یہ چند ہزار جواہر ریزے چنے ہوں بلکہ انہوں نے صحیح احادیث میں سے چند کا انتخاب کیا ہے۔ خود امام بخاری



رحمة اللہ علیہ کہتے ہیں۔

ما ادخلت فی کتابی الجامع الا ما صح و ترکت جملة من الصحاح خشية ان يطول الكتاب.

میں نے اپنی کتاب جامع میں صرف صحیح حدیثیں درج کی ہیں اور میں نے صحیح حدیثوں کا ایک بڑا مجموعہ اس خوف سے درج نہیں کیا کہ کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔  
اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

انما اخرجت هذا الكتاب وقلت هو صحاح و لم اقل ان مالم اخرجہ من الحديث في هذا الكتاب فهو ضعيف.

میں نے اس کتاب میں حدیثیں درج کی ہیں اور کہا کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں اور یہ نہیں کہا کہ جو حدیثیں میں نے اس کتاب میں ذکر نہیں کیں وہ صحیح نہیں ہیں۔

## دوسرا باب

# قرآن کو سمجھنے کیلئے حدیث کی ضرورت کی چند مثالیں

## پہلی مثال

سورہ جمعہ کی یہ آیت ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ. (سورہ جمعہ: 89)

اے ایمان والو جب ندا کی جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو جلدی کرو اللہ کے ذکر کی طرف اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے۔ پھر جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کا فضل۔

ان آیتوں میں چند باتیں قابل غور ہیں

- 1- جمعہ کے دن صلوٰۃ کیلئے ندا کی کیا صورت ہے
- 2- جمعہ کے دن صلوٰۃ کا کیا وقت ہے۔
- 3- جمعہ کے دن صلوٰۃ کی کیا کیفیت ہے۔
- 4- ذکر اللہ سے کیا مراد ہے اور اس کی کیا کیفیت ہے۔

5- جمعہ کے دن کی صلوٰۃ کے بعد زمین میں پھیل کر کیا دنیوی کمائی کرنا ضروری ہے یا اختیاری ہے کیونکہ اَنْتَشِرُوْا اور اَنْتَفُوْا دونوں امر کے الفاظ ہیں اور امر کبھی وجوب کیلئے ہوتا ہے اور کبھی اباحت یعنی اختیار کیلئے ہوتا ہے۔

ان باتوں کا قرآن پاک میں کہیں ذکر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ظاہر ہے کہ ان پر کسی نہ کسی صورت میں عمل کیا ہوگا اور اوپر ہم بتا چکے کہ قرآن کے مطابق آپ کا وہ عمل بطور رسول کے تھا جو ہمارے لئے بھی اتنی ہی حجت و دلیل ہے جتنا کہ اس دور کے لوگوں کیلئے تھی۔

### دوسری مثال

وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ. (سورہ حج: 27-29)

اور آواز لگاؤ لوگوں میں حج کیلئے کہ آئیں تمہارے پاس پیادہ اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر جو چلے آئیں دور راہوں سے تاکہ حاضر ہوں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور لیں اللہ کا نام معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو دیئے۔ سو کھاؤ ان (ذبح شدہ) چوپایوں سے اور کھلاؤ برے حال والے محتاج کو۔ پھر چاہے کہ دور کریں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی غنیمتیں اور طواف کریں قدیم گھر کا۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا. (سورہ بقرہ: 158)

بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو کوئی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے اس میں کہ وہ ان دونوں کا چکر کاٹے۔

فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. (سورہ بقرہ: 198)

پھر جب تم لوگو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو مشعر حرام کے پاس۔

أَيُّمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ (سورہ بقرہ: 196)

پورا کروج کو اور عمرہ کو اللہ کے لئے

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ (سورہ بقرہ: 200)

پھر جب تم پورے کر چکو ج کے کام تو یاد کرو اللہ کو۔

ان آیتوں میں بھی چند باتیں قابل غور ہیں۔

1- حج کو مکمل کرنے کیلئے مناسک کون کون سے ہیں۔

2- عرفات جانا ہے اور واپس بھی آنا ہے۔ وہاں کب جائیں گے اور وہاں سے کب آئیں گے۔

3- مشعر حرام میں کتنی دیر ٹھہرنا ہے۔ پھر مشعر حرام سے آگے منی جانا ہے یا نہیں۔ اگر جانا ہے تو وہاں زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ ٹھہرنا ہے۔

4- بیت اللہ کے طواف کی کیا صورت ہوگی۔

5- صفا اور مروہ کے طواف کی کیا صورت ہوگی۔

ان باتوں کا قرآن پاک میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں حج کیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے وہ حج کسی نہ کسی صورت میں کیا ہوگا۔ آپ کا وہ عمل رسول کی حیثیت سے تھا اس لئے وہ ہمارے لئے بھی اتنا ہی حجت و دلیل ہے جتنا اس دور کے لوگوں کے لئے تھا۔

ان دونوں مثالوں کی مذکورہ باتوں کی تفصیل کا ہمارے پاس چونکہ صرف ایک ہی ذریعہ ہے جو کہ حدیث رسول ہے تو ثابت ہوا کہ قرآن پاک کی بعض باتوں کو کما حقہ سمجھنے کے لئے حدیث ناگزیر ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. (سورہ حجر: 9)

چونکہ اصل حفاظت تو اس وقت ہے جب الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی کی بھی ہو تو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حدیثیں جن پر قرآن فہمی موقوف ہے ان کی بھی حفاظت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو۔ یہاں ہم نے صرف دو مثالیں ذکر کی ہیں ورنہ اگر تفصیل میں جائیں تو قرآن فہمی کیلئے اور بہت سی احادیث ناگزیر ہیں۔

## تیسرا باب

# قرآن کے کہے کے مطابق قرآن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہونے والی بھیا نک غلطیوں میں سے چند ایک مثالیں

پہلی غلطی: صلوٰۃ کی تعداد پانچ نہ ماننا

ڈاکٹر قمر زمان کہتے ہیں

”الصلوٰۃ“ کی تعداد کا حکم قرآن میں سورہ ہود کی آیت نمبر 114 میں بلا شک و شبہ محکم انداز میں وارد ہوا ہے۔ اَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ (اور صلوٰۃ قائم کر دو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر)

اس آیت کا ترجمہ کسی طرح بھی اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ طَرَفَيِ النَّهَارِ کے معنی دو طرف ہی ہو سکتے ہیں۔ البتہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 78 میں اَقِمِ الصَّلَاةَ کا حکم آیا ہے لیکن اس آیت سے بھی تعداد صلوٰۃ تین ہی ثابت کی جاسکتی ہے کسی صورت بھی پانچ نہیں۔

اَقِمِ الصَّلَاةَ لِلذُّلُوكِ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ صلوٰۃ قائم کرو زوال آفتاب کی ساعتوں سے لے کر رات کے اندھیرے تک۔ اس آیت کریمہ میں صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم زوال کے بعد سے لے کر رات کے اندھیرے تک ہے.....

یہاں صلوٰۃ کی دو کی تعداد کا بیان نہیں ہے بلکہ عرصہ دراز کا بیان ہے کہ دن کو سورج جب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو دن کے دوسرے کنارے کی صلوٰۃ کا وقت ہو جاتا ہے اور سورج کے ڈھلتے ہوئے اوقات میں کسی وقت بھی یہ صلوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

جب کہ صلوٰۃ عشاء عَسَقِ اللَّيْلِ یعنی رات کے گہرے اندھیرے تک ادا کی جاسکتی ہے۔“  
ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کی رو سے صلوٰۃ کی تعداد فقط تین ہے۔ ایک صلوٰۃ فجر دوسری صلوٰۃ عشاء اور تیسری زوال آفتاب کے وقت سے لے کر رات تک۔

ہم کہتے ہیں کہ صلوٰۃ کے اوقات کا مندرجہ ذیل تین آیتوں میں ذکر ہے اور کل ملا کر پانچ نمازیں بنتی ہیں

### صلوٰۃ فجر اور صلوٰۃ عشاء

1- مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ

الْعِشَاءِ (سورہ نور 58)

صلوٰۃ فجر سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو دوپہر کے وقت اور صلوٰۃ عشاء کے بعد۔

اس آیت میں تعین کے ساتھ دو نمازوں کا ذکر ہے یعنی فجر اور عشاء۔

### صلوٰۃ عصر اور صلوٰۃ مغرب

2- أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلْفًا مِنَ اللَّيْلِ. (سورہ ہود ص 116)

آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں میں اور رات کے کچھ قریبی حصوں میں اس آیت سے معلوم ہوا کہ دن کے دوسروں پر نماز پڑھنی ہے یعنی فجر کے وقت اور عصر کے وقت جو کہ دن کا دوسرا سرا ہے۔ اس طرح اس آیت سے تیسری نماز بھی ثابت ہوئی غروب آفتاب سے پیشتر دن کے آخری حصے میں (یعنی عصر کی نماز)۔

عصر کی نماز کے بارے میں اس حد تک تو کسی نہ کسی درجے میں ڈاکٹر قمر زمان متفق ہیں کہ یہ دن کے دوسرے سرے میں پڑھنی ہے لیکن اس کے بعد انہوں نے ہاتھ دکھانے کی کوشش

.....  
 کی اور آیت اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ . کو اس بات کی دلیل بنایا  
 کہ عصر کی نماز کا وقت زوال آفتاب کے وقت سے شروع ہوتا ہے حالانکہ یہ دونوں آیتیں اپنے  
 معنی اور مضمون میں مختلف ہیں۔

مثلاً جون کے مہینے میں سورج کے زوال کا وقت دن کے بارہ بجے کے لگ بھگ ہوتا  
 ہے۔ غروب آفتاب تک یہ سات گھنٹے سے اوپر کا وقت بنتا ہے۔ ان صاحب کے بقول یہ سات  
 گھنٹے کی مدت دن کا دوسرا کنارہ اور سہرا ہے۔ چادر کے دو کنارے ہوں کیا اس کا مطلب یہ ہوتا  
 ہے کہ چادر کو لمبائی میں دو حصے میں کر دیا جائے اور یہ چادر کے دو کنارے اور سرے بن گئے۔  
 ایسی بات آخر کوئی لغت اور کوئی عقلی دلیل سے ثابت ہے۔ اور کچھ نہیں تو قرآن پاک ہی سے  
 طرفین کا یہ معنی ثابت کرتے۔ کیا ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی عقل و فہم بھی کوئی Authority  
 ہے کہ ہم اس کے پابند ہوں۔ چادر کا ایک بچ کا بڑا حصہ ہوگا۔ اس حصے کے دونوں طرف جو  
 تھوڑا تھوڑا حصہ ہوگا چادر کا کنارہ اور سہرا کہلاتا ہے۔ ایسے ہی دن کا ایک بڑا بچ کا حصہ ہوگا اور  
 اول و آخر کا تھوڑا تھوڑا حصہ اس کے کنارے اور سرے اور Ends ہونگے۔

غرض اس آیت سے تیسری صلوٰۃ عصر کی ثابت ہوتی ہے لیکن اس کا وقت زوال آفتاب  
 شروع ہونے کے بہت بعد میں ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اس آیت میں ہے وَذُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ (یعنی آپ صلوٰۃ قائم کیجئے رات کے  
 کچھ اولیں حصوں میں۔

ہم کہتے ہیں زلف میں قریب کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے مَا نَعْبُدُهُمْ  
 إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ. (سورہ زمر 3)  
 ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کے درجے میں پہنچا  
 دیں۔

یہاں نہار یعنی دن کے بعد ذُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ کے ذکر سے مراد ہیں رات کی گھڑیاں جو  
 دن کے قریب ہوں۔ اسی لئے علامہ محمد اسد نے بھی جن کا ترجمہ ڈاکٹر قمر زمان صاحب نے نقل  
 کیا ہے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

As well as during the early watches of the night.

.....

قرآن پاک میں زل ف کے مادے کے ساتھ جو استعمال ہے اس کے مطابق رُلْفَا مِّنَ اللَّيْلِ کا ترجمہ یہی زیادہ مناسب ہے کہ رات کی اولین گھڑیوں میں۔ جن حضرات نے اولیں کی قید نہیں لگائی اور صرف یوں لکھا ”رات کے کچھ حصوں میں“ ان کے ساتھ کچھ مخالفت نہیں کیونکہ انہوں نے اولیں حصوں کی نفی نہیں کی۔ چونکہ صلوٰۃ عشاء کا وقت کچھ رات گزرنے پر یا رات گئے ہے تو رات کی اولیں گھڑیوں کی صلوٰۃ اور ہے اور صلوٰۃ عشاء اور ہے۔ رات کی اولیں گھڑیوں کی صلوٰۃ ہی کو صلوٰۃ مغرب کہا جاتا ہے اور یہ صلوٰۃ قرآن ہی سے ثابت ہوئی۔

### صلوٰۃ ظہر

3- اَقِمِ الصَّلَاةَ لِلدُّلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ (سورہ اسراء 78)

نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک  
دلوک شمس کا ترجمہ زوال شمس ہے زوال آفتاب عین نصف نہار کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے اس طرح یہ دن کا وسطی حصہ ہوتا ہے اور اس کو دن کا کنارہ کہنا بڑی غلطی ہے اس بات کو ہم اوپر تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اس آیت میں زوال آفتاب کے شروع ہونے کے بعد اول وقت میں بھی صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم ہے اور چونکہ یہ دن کا وسطی حصہ ہے آخری نہیں لہذا اس وقت کی نماز دن کے آخری حصہ میں پڑھی جانے والی نماز سے مختلف ہوگی۔ اور اس کو ہم صلوٰۃ ظہر کہتے ہیں۔ اس طرح قرآن پاک کے واضح الفاظ سے پانچویں یعنی صلوٰۃ ظہر بھی ثابت ہوئی۔ اور یہی تعداد ہمیں حدیث رسول ﷺ سے بھی ملتی ہے۔

### دوسری غلطی: صلوٰۃ کی قرآنی حقیقت کو بگاڑنا

ڈاکٹر قمر زمان حقیقت صلوٰۃ کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہیں۔  
”آئیے دیکھتے ہیں کہ قرآن صلوٰۃ کا کیا مقام متعین کرتا ہے۔ سورۃ البینہ کی آیت نمبر 5 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا



.....  
 الزُّكُوَّةَ وَ ذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ اور انہیں تو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادیت اختیار کیے رکھیں اس حالت میں کہ دین کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے یعنی صرف اللہ کے لئے حنیف ہو کر اور الصلوٰۃ کو قائم کریں اور الزکوٰۃ کے فریضہ کو ادا کریں اور یہی دین قیم ہے۔  
 (البینہ 5)

یعنی اس آیت میں دین قیم کو اللہ کی خالص بندگی سے مقید کیا گیا اور اس دین قیم کے دو ستون الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ بتائے گئے.....

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا موضوع ہی دین قیم ہے اور قرآن میں اللہ پاک نے دین قیم کو ہی بمعہ تمام تفصیلات اور جزئیات بیان فرمایا.....

آئیے دیکھتے ہیں کہ اللہ نے جس صلوٰۃ کو دین قیم قرار دیا ہے وہ قرآن میں کس شکل میں بیان ہوئی ہے.....

قرآن میں صلوٰۃ کسی جگہ تو مکمل دین کے حوالے سے بیان ہوئی ہے تو کہیں صلوٰۃ سے وہ علامتی عمل مراد لیا گیا ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں نماز کہتے ہیں.....

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جس اصطلاح کو پسند فرمایا ہے وہ صلوٰۃ ہے جس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں نبی کی تمام تر زندگی سما جاتی ہے۔ سورہ ابراہیم کی آیت نمبر 37 میں سیدنا ابراہیم کی وہ دعائے کور ہے جب وہ سیدنا اسماعیل کو ایک ایسی وادی میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں زراعت نہیں ہوتی تھی۔

اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذٰلِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لَتُقِیْمُوْا الصَّلٰوةَ.

اے میرے رب میں نے ایسی وادی میں جہاں زراعت نہیں ہوتی اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس لایا یا تا کہ وہ صلوٰۃ قائم کریں۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ سیدنا ابراہیم نے اللہ کے دین کے لئے سیدنا اسماعیل کی اتنی بڑی قربانی دی تو کیا صرف نماز پڑھانے کے لئے دی تھی؟ یا اس صلوٰۃ کا کوئی اور مفہوم ہے۔

اور اگر سیدنا اسماعیل کی قربانی صرف نماز پڑھانے کے لئے ہی تھی تو ہونا تو یہ چاہئے تھا

.....

..... کہ نہ صرف سیدنا اسماعیل بلکہ ان کی اولاد جس میں رسالت مآب بھی شامل تھے صرف نماز ہی پڑھتے اور پڑھاتے رہتے اور اس تمام جدوجہد کی ضرورت ہی کیا تھی جو رسالت مآب نے اتنی مصیبتیں اٹھا کر کی اور ایک معاشرے کو مدینہ میں قائم کر دکھایا دوسرے رسول بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ رسالت مآب کو تو اپنی امت کو صرف نماز کے پڑھنے پڑھانے کی ہی تلقین کرنی چاہئے تھی باقی جدوجہد انہوں نے کس حکم کے تحت کی؟.....

یعنی ان آیات میں صلوٰۃ سے مراد وہ نظام ہے جو احکامات و اقدار الہی کے تحت متشکل ہوتا ہے اور جس میں پابند کیا جاتا ہے کہ انسان اپنی معیشت کا نظام خود ساختہ بیانیوں کے تحت نہیں بنائے گا بلکہ اس کے اصول اقدار الہی کے تحت بنانے پڑیں گے۔“ (حقیقت صلوٰۃ

(8۲4)

ڈاکٹر قمر زمان آگے صفحہ 25 پر حکمت صلوٰۃ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔  
 ”اللہ تبارک تعالیٰ کسی بھی حکم کو بغیر حکمت بیان نہیں فرماتے۔ الصلوٰۃ کی بھی حکمت بیان کی گئی ہے..... ارشاد ربانی اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي میرے ذکر کے لئے صلوٰۃ کو قائم کرو۔  
 اب سوال اٹھتا ہے کہ ذکر کیا ہے؟ کیا ذکر سے مراد صرف اللہ کا ورد ہے یا کچھ اور؟  
 قرآن کو اللہ تبارک تعالیٰ نے بڑے صاف الفاظ میں ذکر کیا ہے اَلْقُرْآنِ ذِی الذِّکْرِ (38/1) اور سورہ الحج میں فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم نے الذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (15/9)

اب یہ واضح ہو جانے کے بعد قرآن ہی اللہ کا ذکر ہے سورہ طہ کی آیت کا مطلب بھی واضح ہو گیا۔

اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (میرے ذکر کے لئے صلوٰۃ قائم کرو) (طہ 20/16) یعنی اللہ کے قرآن کی حاکمیت اور احکامات قرآنی کے نفاذ کے لئے صلوٰۃ قائم کرو تا کہ ایسا مثالی معاشرہ قائم ہو جس کی بنیادیں اللہ کے کلام میں دیئے گئے اصولوں پر رکھی گئی ہوں۔ جس کے لئے شعوری طور پر اللہ کو حاضر جان کر ہر شخص اس بات کا اقرار کرے کہ اے اللہ میں آپ کے ہر حکم کی اطاعت کرتا ہوں میری زندگی آپ کے احکامات کی تکمیل کا مکمل نمونہ ہے میری زندگی کا

.....  
 ہر لمحہ آپ کے احکامات کی فرمانبرداری ہی میں گزرتا ہے اور اس عبدیت کے شعوری اظہار کے لئے میں حاضر ہو گیا میرا مقصود آپ کے قوانین کا اس دنیا میں نفاذ ہے اور میں صرف اور صرف آپ کی ہی عبدیت اختیار کرتا ہوں اس لئے میری عبدیت کا شعوری اظہار صلوٰۃ کی ادائیگی ہے۔

لیکن ہم نے اس عبدیت کو جو ہمارے لئے ہمہ جہت اور ہمہ وقت اللہ کے دیئے ہوئے اصولوں کے تحت زندگی گزارنے کا نام ہے عبادت میں بدل ڈالا اور اب ہماری صلوٰۃ میں سب کچھ ہوتا ہے لیکن وہ عبدیت نہیں ہوتی جس کے لئے ہم کو صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تھا۔ ہم مقصود کو بھی بھول گئے اور صرف صلوٰۃ کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے جو مقصود بالذات کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ (حقیقت صلوٰۃ ص 23, 24)

### ہم کہتے ہیں

ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صلوٰۃ بمعنی نماز جو کہ ایک عبادت ہے وہ ذریعہ ہے اس صلوٰۃ کا جس سے مراد وہ نظام ہے جو احکامات و اقدار الہی کے تحت متشکل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر قمر زمان کی یہ فکر سراسر غیر قرآنی ہے اور اس میں ان سے چند فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ یہ غلطیاں ذکر کرتے ہوئے ہم اصل قرآنی فکر کو بھی پیش کرتے ہیں۔

### ڈاکٹر قمر زمان کی پہلی غلطی

ڈاکٹر قمر زمان نے سورہ بینہ کی آیت نمبر 5 میں یہ الفاظ دین القیمہ کو مرکب توصیفی خیال کیا ہے اسی لئے انہوں نے انکا ترجمہ موصوف صفت کی صورت میں کیا ہے یعنی دین قیم حالانکہ عربی کی معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ یہاں مرکب توصیفی نہیں ہے بلکہ مرکب اضافی ہے اسی لئے القیمہ پر کسرہ یعنی زیر ہے۔ اور القیمہ کا موصوف حذف ہے جو کتب ہے جس کا ذکر اسی سورت میں کچھ پہلے ہوا ہے یعنی کتب قیم۔ لہذا عبارت یوں بنتی ہے ذٰلِکَ دِیْنُ الْکُتُبِ الْقِیْمَةِ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ کتب قیمہ کا طریقہ ہے یعنی یکسو ہو کر اور اللہ کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرنا (جس کے دو بڑے ستون اقامت صلوٰۃ اور ایٹائے

.....

زکوٰۃ ہیں) کتب قیمہ کا طریقہ ہے۔

یہ بات ہم نے اپنی طرف سے نہیں گھڑی بلکہ یہی مضمون قرآن پاک میں ایک اور مقام پر ذکر ہوا ہے سورہ شوریٰ کی آیت نمبر 13 ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ.

راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا تھا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو دین کو۔

اس آیت میں دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے ریاست یا ایسا نظام قائم کرنا مراد نہیں ہے جو مرکزی اتھارٹی کے گرد گھومتا ہو اور حکومت و اقتدار کا تقاضا کرتا ہو۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو ایک مثالی معاشرہ اور نظام قائم کرنے کا حکم دیں اور رسول اس حکم کو پورا نہ کریں اور یہ اس طرح کہ خود قرآن پاک کی شہادت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی قوم غرق ہوئی اور صرف چند لوگ بچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر بیابان میں پھرتے رہے اور اسی حالت میں ان کی وفات ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو بس چند گنے چنے لوگ اسلام لائے اور وہ کوئی مثالی معاشرہ یا نظام قائم نہ کر سکے۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ دین کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور ابتداء کوشش سے ہوتی ہے لہذا ان رسولوں کی کوشش اسی حکم کو پورا کرنے کے لئے تھی۔ اور گویا حکم میں ان سے مطالبہ بھی یہی تھا کہ تم کوشش کرو۔ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی تاویل غیر معقول ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز سے باخبر ہیں وہ غیر مناسب موقع پر ایسا حکم کیونکر دیں گے؟ ابتداء میں تو تبلیغ اور انداز کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور جب اس تبلیغ و انداز کے نتیجے میں افراد کی ایک کافی تعداد مہیا ہو جاتی ہے اور معاشرہ اور نظام قائم ہونے کی بنیادیں پڑ جاتی ہیں اس وقت اس سے متعلق اصول و ضوابط اور احکام دئے جاتے ہیں۔

1- غرض حضرت نوح اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دین قائم کرنے کا حکم دیا گیا اور انہوں نے یقیناً اس پر پورا عمل کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں دین سے مراد عقائد اور عبادات

.....  
اور اخلاق حسنہ کی تحصیل ہے۔ تو یہ کتب قیمہ کا دین ہوا۔ اور کتب قیمہ کا خلاصہ قرآن پاک کے اوراق میں بھی ذکر ہوا اس لئے فرمایا:

رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ. (سورة بينہ 3)

اللہ کا ایک رسول پڑھتا ہے پاک ورق اس میں لکھی ہیں مضبوط کتابیں۔

2- مثالی معاشرہ اور نظام قائم کرنے کے لئے کسی علاقے میں حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا ذکر بھی قرآن پاک میں ہے فرمایا:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (سورة حج: 61)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں زمین میں تو وہ قائم کریں صلوٰۃ کو اور ادا کریں زکوٰۃ

کو۔

لیکن حکومت کا بالفعل قائم ہو جانا یہ محض اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لئے اس آیت میں قدرت و حکومت دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور امر واقع بھی ایسا ہی ہے کیونکہ بسا اوقات کوشش کے باوجود مطلوبہ نتائج نہیں نکلتے۔

### ڈاکٹر قمر زمان کی دوسری غلطی

سورة بینہ کی آیت نمبر 5 میں ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ اسکا ترجمہ ڈاکٹر قمر زمان نے یوں کیا ہے اور انہیں تو

صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت اختیار کئے رکھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر قمر زمان

نے لِيَعْبُدُوا کا ترجمہ عبادت یعنی خدمت اور غلامی کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی

پہلی غلطی کے تحت ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کے ساتھ ترجمہ کر

کے ڈاکٹر قمر زمان نے فاش غلطی کی اور اس کا صحیح ترجمہ عبادت ہے عبادت نہیں اور عبادت

چونکہ ہر شخص کی قدرت میں ہے اور کسی نظام اور حکومت کی محتاج نہیں اس لئے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (سورة ذاریات 56)

اور میں نے جن و انس پیدا کیا جن کو اور آدمی کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اسی طرح سورة مریم آیت نمبر 25 میں فرمایا: فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ. (سواس کی

.....

.....  
 بندگی کر اور قائم رہ اس کی عبادت پر) اس آیت میں واضح طور پر عہد سے عبادت مراد ہونے کی نشاندہی کر دی کہ عبادت کر کے چھوڑنا نہیں بلکہ اس پر قائم بھی رہنا ہے۔

### ڈاکٹر قمر زمان کی تیسری غلطی

ڈاکٹر قمر زمان صاحب نے عبادت کو ذریعہ بتایا ہے اور مثالی معاشرہ و نظام قائم کرنے کو اصل مقصود کہا ہے۔ ہماری مذکورہ بالا وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے اور عبادت رب اصل مقصود ہے جب کہ معاشرہ و نظام کا قیام عبادت کی پر امن ادائیگی کے لئے معاون ہوتا ہے۔

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت کہتے ہیں

اقصى غايه التذلل ولذلك لا تستعمل الا فى الخضوع لله تعالى .  
 انتہائی درجے کی ذلت و عاجزی کے اظہار کو (اور چونکہ اس کی مستحق صرف وہ ذات ہے جو غایت درجہ فضیلت و کمال والی ہے) لہذا عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کی جانے والی عاجزی کو کہتے ہیں۔

بعض حضرات نے اس کے ساتھ محبت کی آمیزش کا بھی ذکر کیا ہے جس کا سبب یا تو احسان ہوتا ہے یا کسی کی خوبیاں (یعنی صفات کمال) ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ میں یہ دونوں ہی باتیں پائی جاتی ہیں لہذا عبادت کا مطلب ہوا محبت اور شکر کے جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی درجے کی ذلت و عاجزی کو اختیار کرنا۔ اس کے برخلاف عہدیت کا مطلب فقط اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بڑا اور حاکم جانتے ہوئے اس کے حکموں کو پورا کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے محبت اور شکر کے جذبات کا ہونا ضروری نہیں۔

قرآن پاک میں بھی احسان و انعامات پر عبادت کو متفرع کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ شکر و احسان مندی کے طور پر بندگی ہو اور وہ صرف عبادت میں ہوتی ہے خدمت و غلامی میں نہیں۔

1- يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ  
 الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنْ

.....

الْعَمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ. (سورة بقرہ: 21-22)

اے لوگوں عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پر ہمیز گار بن جاؤ جس نے بنایا تمہارے واسطے زمین کو کچھونا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے کے واسطے۔

2- وَمَالِيَ لَا أُعْبُدُ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي (سورة یسین 23)

اور مجھ کو کیا ہوا کہ میں عبادت نہ کروں اس کی جس نے مجھے بنایا۔

اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال سے متصف ہیں اور اپنے بندوں پر ان کی نعمتیں اور احسان بے شمار ہیں اور عقل کا فیصلہ ہے کہ نعمتیں دینے والے کا شکر ادا کیا جائے اور قابل تعریف صفات سے متصف کی تعظیم کی جائے۔ اللہ کے شکر و تعظیم کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ اور چونکہ نعمتیں ہر آن ہیں لہذا تعظیم بھی ہر آن کی جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محض ہماری عقل پر نہیں چھوڑا بلکہ عبادت کے طریقے خود بتائے۔

لیکن شکر و امتنان اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ عبادت کے افعال کی کمال درجے کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ دل و دماغ کو سکون و اطمینان حاصل ہو۔ ذہنی انتشار اور مختلف قسم کی پریشانیاں خلل کا موجب بنتی ہیں۔ اور انتشار اور پریشانیاں آپس کے جھگڑوں سے اور آپس کی خیر خواہی کو ترک کرنے سے جنم لیتی ہیں لہذا اللہ تعالیٰ نے معاملات اور حقوق سے متعلق احکامات دیئے تاکہ ان پر عمل کر کے جھگڑوں اور حق تلفی سے بچاؤ ہو سکے۔ اور لوگ باہمی معاملات اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق کریں اور آپس میں حق تلفی اور ظلم نہ کریں اس کے لئے حکومت کی ضرورت ہوئی تاکہ وہ ظالموں کو ظلم سے روکے اور لوگوں کو اللہ کے احکامات کا پابند کرے۔

غرض عبادات اور معاملات وغیرہ سب ہی دین کے احکامات ہیں لیکن ان میں عبادات کو اصلی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اور معاملات وغیرہ اس کے گرد گھومتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر زمان صاحب ذوق لطیف اور ذوق جمال سے بھی عاری ہیں اس لئے ان کو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان صرف حاکم و محکوم کا تعلق نظر آتا ہے۔

.....  
حالانکہ قرآن پاک میں جا بجا اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات اور شانوں کے ذریعے ان کی معرفت کا ذکر ہے اور ایک کی دوسرے کے ساتھ محبت کا ذکر بھی ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ. (آل عمران: 31)  
آپ کہہ دیجئے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ۔

عبادت کی اسی اہمیت کی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں عبادت سے اعراض کرنے والوں کو سخت وعید سنائی۔

1- إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ. (سورة غافر)  
(60)

بے شک جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے عنقریب وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ہو کر۔

2- وَمَنْ يُسْتَكْبَفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا. (سورة نساء: 172)۔

اور جوئی کوئی عار کرے اللہ کی عبادت سے اور تکبر کرے سو وہ جمع کرے گا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا۔

## تیسری غلطی: جِنّات کا انکار کرنا

پرویز کہتے ہیں

”قرآن کریم میں ہے کہ جب کرہ ارض پر ہنوز انسانوں کی آبادی نہیں ہوئی تھی تو اس میں جو مخلوق یہاں بستی تھی اس میں حرارت برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ اس کے بعد وہ مخلوق ختم (Extinct) ہو گئی اور اس کا جانشین انسان ہوا۔

جن وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ انہیں خانہ بدوش قبائل کہا جاتا ہے..... عربوں میں یہ صحرائین قبائل بہت زیادہ تھے (انہیں بدویا اعراب کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور



صحرائیوں سب کی طرف تھا اس لئے اس نے جن وانس دونوں گروہوں کو مخاطب کیا ہے۔  
سورۃ جن اور سورۃ احقاف سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو جن رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن سننے کے لئے آئے تھے وہ انسان ہی تھے۔

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جن وانس کے لشکر تھے۔ ان جنوں کے متعلق سورۃ سبا میں ہے کہ وہ ہیکل کی تعمیر کا کام کرتے تھے، مجسمے تراشتے تھے، لگن اور دیکیں بناتے تھے، سمندروں میں غوطہ خوری سے موتی نکالتے تھے، انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن میں جن وانس سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔ انس جو مانوس تھے اور جن جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباریوں میں سے ایک کے لئے عفریت من الجن آیا ہے یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط، قوی ہیکل اور چست و چالاک آدمی۔“  
پرویز کے ان اقتباسات کا حاصل یہ ہے کہ انسان سے علیحدہ ایک مخلوق تھی جو انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد قرآن میں جن کو جن کہا گیا ہے ان سے مراد جنگلوں اور صحراؤں میں رہنے والے غیر مہذب اور غیر متمدن انسان ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ

ہم متعلقہ آیتیں لکھتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ پرویز صاحب کی یہ باتیں قرآن کے بالکل خلاف ہیں:

1- قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ قَالَ عِفْرِيْتُ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيَّ أَمِينٌ (سورہ نمل: 38, 39)

(سلیمان علیہ السلام نے) کہا اے دربار والوں تم میں سے کون اس (ملکہ سبا) کا تخت میرے پاس لاسکتا ہے پیشتر اس کے کہ وہ (یعنی ملکہ سبا اور اس کے ہمراہی) میرے پاس فرماں

بردار ہو کر پہنچیں۔ جنوں میں سے ایک (قوی ہیکل) دیو نے کہا میں اس کو آپ کے پاس آپ کے اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے لے آؤں گا اور میں (اس کام پر) زور آور اور امانت دار ہوں۔

بھلا بتائیے ایک انسان خواہ وہ کتنا ہی چست و چالاک ہو اور کتنا ہی زور آور ہو محض دو چار گھنٹوں میں ایک دور دراز کے ملک میں جا کر وہاں کے شاہی محل سے بلا مزاحمت شاہی تخت اٹھا کر لے آئے یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ وہ تخت اتنا وزنی اور اتنا لمبا چوڑا ہو کہ ایک انسان کی انتہائی قوت کے تحمل سے باہر ہو۔

2- وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحُ غَدُوَهَا شَهْرًا وَرَوَّاحُهَا شَهْرًا وَاسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَن يَزِغُ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّسِيتَ اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَاتِهِ فَلَمَّا خِرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنَّهُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ. (سورہ سبا 12 تا 14)

اور مسخر کر دیا ہم نے سلیمان کے لئے ہوا کو۔ ہوا کی صبح کی منزل ایک مہینے کی اور شام کی منزل ایک مہینے کی اور بہا دیا ہم نے اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ۔ اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے تھے اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے اور جوان میں سے سرکشی کرے ہمارے حکم سے تو ہم اس کو پکھائیں آگ کا عذاب۔ وہ جن بناتے ہیں سلیمان کے لئے جو وہ چاہتا ہے قلعے اور تصویریں اور تالاب کی طرح کے (بڑے بڑے) تسلی اور (چولہوں پر) جھی ہوئی دیکھیں۔ اے آل داؤد (نیک) عمل کرو احسان مانتے ہوئے اور میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی ہیں احسان ماننے والے۔ پھر جب ہم نے مقرر کیا سلیمان پر موت کو تو وہ نہیں رہنمائی کی اس کی موت پر مگر زمین کے کیڑے (دیمک) نے جو کھا تا رہا سلیمان کا عصا (جس کے سہارے وہ اپنی موت کے بعد بھی اپنی سابقہ ہیئت پر قائم رہے۔ جب عصا دیمک زدہ ہو کر گرا پھر (سلیمان بھی گرے اور) جب سلیمان گرے تب جنوں پر واضح ہو گیا کہ اگر وہ غیب کو جاننے ہوتے (تو سلیمان علیہ السلام کی موت کو بھی جان لیتے اور) نہ رہتے رسوا کن عذاب

میں۔

- 1- بھلا بتائیے کیا خانہ بدوش اور گنوار قسم کے لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا اور آگ سے جلانا کیا جائز تھا۔ کیا ان سے بیگاری جاری تھی؟ اگر اجرت پر کام لیا جا رہا تھا تو سرکشی پر ان کو فارغ کر دیا جاتا ایسی سخت سزا دینا کس قانون سے جائز ہے؟
- 2- پھر ایسی صنعت کا گنواروں سے کیا تعلق؟ گنوار مزدوری تو کر سکتے ہیں وہ معمار اور فنکار کیسے بن گئے۔ ایسے کام کو شہری لوگ زیادہ بہتر کر سکتے ہیں۔
- 3- گنواروں کو علم غیب سے کیا تعلق تھا
- 4- کام یا مزدوری کو رسوا کن عذاب کہا گیا۔ کیا وہ گنوار جنگی قیدی تھے کہ جن کے لئے وہ مزدوری رسوا کن عذاب تھی۔

غرض یہاں جنوں سے خانہ بدوش اور گنوار قسم کے لوگ مراد لئے جائیں تو مذکورہ بالا اشکالات پیش آتے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ملتا۔

پھر لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ یہاں جنوں سے مراد انسان سے الگ ایک مخلوق ہے جو آتش الاصل ہے اس کے لئے آگ سے جلانے کی سزا غیر معمولی نہیں اور ممکن ہے کہ ان کی کسی شرارت پر ان کو سزا میں قید کیا گیا ہو اور بیگار کے طور پر ان سے یہ بڑے بڑے کام لئے جا رہے ہوں۔

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَكِنْ نُّشْرِكُ بِرَبِّنَا أَحَدًا وَأَنَّهُ تَعَالَى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا وَأَنَّهُ كَانَ يَفْقُولُ سَفِينُهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا وَأَنَا ظَنَنَّا أَنَّ لَنْ تَقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَنَّ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا وَأَنَا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مَلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا وَأَنَا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْمَعِ آلَانَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا وَأَنَا لَا نَلْزِمِي أَشْرًا أُرِيدُ بَعْنَ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا وَأَنَا مِّنَ الصَّالِحِينَ وَمِنَّا دُونَ ذَلِكَ كُنَّا طَرَائِقَ قَدَدًا وَأَنَا ظَنَنَّا أَنَّ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ

وَلَنْ نُعْجزَهُ هَرَبًا وَاَنَا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰى اٰمَنَّا بِهِ فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا  
وَلَا رَهَقًا. (سورہ جن 13-1)

آپ کہہ دیجئے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ (اس قرآن کو) سنا جنوں کی ایک جماعت نے پھر کہا ہم نے سنا ایک عجیب قرآن (جو کہ) دکھاتا ہے نیک راہ تو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور یہ کہ ہمارے رب کی شان اونچی ہے۔ اس (یعنی ہمارے رب) نے (اپنے لئے نہ تو بیوی رکھی ہے اور نہ ہی کوئی بچہ رکھا ہے اور یہ کہ ہم میں سے بیوقوف لوگ اللہ پر بڑھا چڑھا کر باتیں کرتے تھے حالانکہ ہم خیال کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے اور یہ کہ انسانوں میں سے کتنے ہی لوگ پناہ لیتے تھے جنوں میں سے کتنے ہی لوگوں کی (اور اس طرح) انسانوں نے جنوں کو سرکشی میں بڑھا دیا۔ اور یہ کہ جیسے تم (جن) خیال کرتے ہو ایسے ہی انسان بھی خیال کرتے تھے (کہ) اللہ ہرگز کسی کو بھی قبروں سے) نہ اٹھائے گا۔ اور یہ کہ ہم نے ٹٹولا آسمان کو تو ہم نے اس کو سخت چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا۔ اور یہ کہ ہم (فرشتوں کی بات) سننے کے لئے ٹھکانوں میں بیٹھا کرتے تھے لیکن اب (موجودہ زمانے میں ہم یہ تبدیلی دیکھ رہے ہیں کہ) جو کوئی سننا چاہے تو وہ اپنے لئے گھات لگایا ہوا انگارہ پاتا ہے۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین پر رہنے والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ ہدایت کا ارادہ کیا ہے اور یہ کہ ہم (جنوں) میں نیک لوگ بھی ہیں اور ہم میں اس کے علاوہ (یعنی برے لوگ) بھی ہیں۔ ہم کئی راہوں پر پھٹے ہوئے تھے۔ اور یہ کہ ہم نے خیال کر لیا ہے کہ اللہ کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے زمین میں (چھپ کر) اور نہ ہی ہم اس کو عاجز کر سکتے ہیں بھاگ کر۔ اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی بات سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور جو کوئی ایمان لائے اپنے رب پر تو وہ نہ نقصان سے ڈرے گا اور نہ زبردستی سے۔

ان آیتوں کا مضمون اس بات پر صریح دلیل ہے کہ جنوں سے مراد خانہ بدوش اور گنوار انسان نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ کلام انتہائی سمجھداری کا تھا۔ کسی جاہل خانہ بدوش کا کلام ایسا نہیں ہوتا پھر ان آیتوں میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

- 1- آسمانوں پر انہوں نے سخت چوکیدار دیکھے۔ اگر ان آسمانی چوکیداروں کو فرشتے کہا جائے تو کیا استبعاد ہے؟
- 2- جن آسمان پر فرشتوں کی باتیں سن لیتے تھے۔
- 3- قرآن کے نزول کے زمانہ میں فرشتوں کی بات سننے کی کوشش کرنے پر آگ کا انگارہ جا لگتا تھا۔

### چوتھی غلطی: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ماننا

پرویز اور محمد شیخ اور ان جیسے دوسرے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے پرویز لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کر سکیں گے نہ صلیب دے سکیں گے بلکہ تم اپنی طبعی موت مرو گے۔ (إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ) یہ لوگ تمہیں صلیب دے کر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کریں گے۔ (وَرَأَيْتُكَ إِلَيَّ) اور یہ اس طرح سے ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے (وَمُطَهَّرُكَ مِنَ الدِّينِ كَفَرُوا) چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے کہ یہودی حضرت مسیحؑ پر ہاتھ ڈالتے آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق وہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تھی خدا کی تدبیر جو کامیاب ہوئی۔

اسی طرح سورہ مائدہ میں ہے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے فَلَمَّا تَوَلَّيْتَنِي كُنْتُ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔“  
محمد شیخ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وفات پا جانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

### ہم کہتے ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وفات پا جانے کا قول کرنا اور اس کو قرآن پاک سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بالکل غلط ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

1- سورہ مائدہ میں ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَعْيسَىٰ بَنُ مَرْيَمَ ءَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ الْهَيْبِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ عِبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ.

جب کہے گا اللہ (قیامت کے دن) اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو۔ (جواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے تو پاک ہے مجھے تو یہ لائق نہیں کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا کہ تو تجھ کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بے شک تو ہی چھپی باتوں کو جاننے والا ہے۔ میں نے تو ان کو صرف وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور جب تک میں ان میں رہا میں ان کے (کے حالات) پر خبردار تھا پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا تو (پھر) تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا اور تو ہی ہر چیز سے خبردار ہے۔

اگر خط کشیدہ عبارت کا ترجمہ وہ کریں جو پرویز نے کیا ہے یعنی پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو مطلب صحیح نہیں رہتا کیونکہ پرویز کے بقول یہود کی تدبیر کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں سے ہجرت کر گئے اور بعد میں اپنی طبعی موت مرے۔ ہجرت کے وقت سے طبعی موت پانے تک ظاہر ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام حالات کی نگرانی نہیں کر پائے لیکن بجائے اس کے کہ وہ یہ فرماتے کہ پھر جب میں ہجرت کر گیا تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا پرویز صاحب کے بقول وہ یہ فرمائیں کہ پھر جب تو نے مجھ کو وفات دے دی تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا تو یہ بات واقعہ سے مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ کہنا کہ رسول کی بات واقعہ کے مطابق نہیں تھی قابل تسلیم نہیں لہذا یہی ماننا پڑے گا کہ پرویز وغیرہ نے جو ترجمہ کیا وہی غلط ہے اور صحیح ترجمہ یہ ہے کہ پھر جب تو نے مجھ کو اٹھالیا (یعنی

زندہ آسمان کی طرف) تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا۔

2- وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ. (سورہ نساء: 159)  
اور نہیں کوئی اہل کتاب (یعنی یہود اور عیسائی) مگر یہ کہ وہ ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی موت سے پہلے۔

اگر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے تو قرآن کی یہ بات تو پوری نہیں ہوئی اور قرآن کی کوئی بات پوری نہ ہو یہ ممکن نہیں لہذا یہی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی اور ان کی وفات کے وقت کوئی یہودی یا عیسائی ایسا نہ ہوگا جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر معتبر ایمان حاصل نہ ہو اور وہ مسلمان نہ ہو چکا ہو۔

3- وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ. (سورہ نساء: 157)  
اور یہود نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اٹھالیا اپنی (بنائی ہوئی بلندی کی) طرف (جو کہ زمین کے مقابلہ میں آسمان کو حاصل ہے)۔  
پرویز نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے۔

اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیئے اور اس طرح اپنا مقرب بنالیا۔  
اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ  
ورنہ اگر رَفَعَ کے معنی جسمانی طور پر اوپر اٹھالینے کے لئے جائیں تو اِلَیْہ (خدا کی طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ کے معنی یہی ہیں کہ اللہ نے اس کے درجات بلند کر کے اسے اپنا مقرب بنالیا۔

پرویز نے جو وجہ ذکر کی ہے وہ اس معنی سے جو ہم نے کیا ہے اپنا وزن کھو بیٹھتی ہے۔  
کیونکہ جب ایک دوسرے ممکن معنی کا احتمال (Possibility) ہونا ظاہر ہو گیا تو ان کا استدلال جاتا رہا۔

4- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے علاقہ سے ہجرت کر جانا اور اپنی طبعی موت مرنا کسی بھی معتبر تاریخ میں نہیں ملتا۔ کسی قبر پر عیسیٰ لکھے ہونے سے اس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہونے پر قطعی تو کیا ظنی دلیل بھی نہیں۔

5- پرویز کا بتایا ہوا معنی خود قرآن کے اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جب الفاظ میں کوئی اور قرینہ موجود نہ ہو تو قرآن درجہ و مرتبہ میں بلندی کے لئے درجات یا مکان کے لفظ کی قید لگاتا ہے۔

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ اور بلند کیا ان کے بعض کو درجوں میں  
وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (سورہ مریم: 57) اور بلند کیا ان کو اونچے مرتبے میں  
پھر مُتَوَفِّيكَ کا ترجمہ وفات دینے میں قطعی نہیں ہے۔ خود قرآن پاک میں ہے۔  
اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَ مَيِّهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ  
عَلَيْهَا الِّمُوتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ. (سورہ زمر: 42)

اللہ لے لیتا ہے جانوں (یعنی روحوں) کو (پرویز نے اس کا ترجمہ انسانی ذات سے کیا ہے) کو ان کی موت کے وقت اور جن جانوں کی موت نہیں آئی ان کو لے لیتا ہے۔ (یعنی قبض کر لیتا ہے) ان کی نیند میں پھر جن پر موت کا فیصلہ کر دیا ان کو روک لیتا ہے اور دوسری (روحیں جن کی موت نہیں آئی ان) کو چھوڑ دیتا ہے۔

اس آیت میں تَوَفَّى کا مطلب روح کو لے لینا ہے تو مُتَوَفِّيكَ سے وفات مراد لینا قطعی نہیں بلکہ پورا پورا لینا (یعنی روح و جسم دونوں کو لے لینا) بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

پانچویں غلطی: نظریہ ارتقاء کو قرآن سے ثابت کرنا

پرویز لکھتے ہیں۔

سلسلہ کائنات کی ابتداء اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصولی نظام بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطہ ماسکہ ہے۔ ارشاد ہے۔

يُذَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يُعْرِجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ.

جب کسی سکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو قانون مشیت کے مطابق زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے پھر وہ سکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے مقام تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا



ایک وقفہ تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔

یہاں ان مراحل کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہزار ہزار برس کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کے ہوتے ہیں۔

خدا کے اسی نظام ارتقاء کی رو سے اس نے کہا ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے۔ سورہ الانبیاء میں ہے۔ **جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ** اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے۔

اس کے بعد اس نے ان تخلیقی مراحل کا ذکر کیا ہے جن میں سے گزر کر زندگی پیکر انسانی تک پہنچی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:

**وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ**۔ اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی۔

دوسری جگہ طین کی بجائے تراب کا لفظ آیا ہے۔ طین یا تراب غیر جاندار مادہ تھا۔ جب اس کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو وہ طین لازم یعنی چپچہپی مٹی بن گیا۔ سورہ صافات میں ہے کہ **إِنَّا خَلَقْنَا هُم مِّنْ طِينٍ لَّازِبٍ**۔ قرآن نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مٹی اور پانی کے امتزاج یعنی اس گارے کی صورت یہ نہیں تھی کہ اس میں مٹی زندگی میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اس ”مٹی کا خلاصہ“ پانی سے ملا تو اس سے زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوئی چنانچہ سورہ مومنون میں ہے۔ **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ**۔ اس آیت میں ”مٹی کے خلاصہ“ کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم جب کوئی بیج زمین میں بوتے ہیں تو وہ ان اجزاء کو جن پر اس کی نشوونما کا مدار ہوتا ہے زمین سے کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ انہی اجزاء (نمکیات، معدنیات وغیرہ) کو **سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ** یعنی مٹی کا خلاصہ کہا جائے گا۔ اس قسم کے مٹی کے خلاصہ سے حیات کا پہلا خلیہ (Cell) وجود میں آیا۔

قرآن کریم نے دیگر مقامات میں ایک اور حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس نے اشارۃً یہ بتایا ہے کہ پانی اور مٹی کے اس امتزاج کے ساتھ حرارت کی بھی ضرورت تھی لیکن ان عناصر ترکیبی میں ایک خاص توازن یا تناسب نہایت ضروری تھا۔ اگر وہ تناسب قائم نہ رہے تو وہ مٹی سوکھ کر ٹھیکری بن جائے۔ چنانچہ سورۃ الرحمن میں ہے **خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ** ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جس کی کیفیت یہ تھی کہ (اس میں

اگر حرارت کی زیادتی ہو جائے تو وہ سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بجنے لگ جائے۔ لیکن ہم نے ان اجزاء میں ایسا تناسب قائم کیا کہ اس سے زندگی کا اولین جراثیمہ وجود میں آ گیا۔“ اسے قرآن کریم نے ”نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“ کہہ کر پکارا ہے یعنی ایسا خلیہ جس میں نرمادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ وہ واحد یعنی ایک (Unit) تھا۔ سورۃ الانعام میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ.

خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقت معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی منزل کے سپرد کرے۔ اس طرح تم ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے پیکر انسانی میں پہنچے۔

انہی مراحل اور منازل کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ لَنَرَكُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ تَمَّ بَقِيَّتَا ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے اور اس کے بعد شہرہا حیات پر اسی طرح آگے بڑھتے اور بلند ہوتے جاؤ گے۔“ ارتقائی منازل میں اسی تبدل و تحول کے متعلق دوسری جگہ کہا وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَرًا اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ تم طور طریقے بدلتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔

سب سے پہلے زندگی کے جس خلیہ کی نمود ہوئی اس میں نرمادہ کی تمیز نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ خلیہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک حصہ نے زر کی شکل اختیار کی اور دوسرے نے مادہ کی۔ گویا یہ جوڑا اسی نفس واحدہ سے وجود میں آیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا. (سورہ: اعراف 189)

تمہارا نشوونما دینے والا وہی ہے جس نے تمہیں ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا۔  
ان تخلیقی مراحل کو طے کرتی ہوئی زندگی اس مرحلہ میں آ پہنچی جہاں افزائشِ نسل بذریعہ تناسل یعنی نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے درجہ حیوانات کہا جاتا ہے۔ سورۃ السجدہ میں ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ. (سورہ سجدہ: 8)

”پھر اس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔“

ہم کہتے ہیں۔

پرویز نے اس ایک فلسفہ کو اختیار کر کے کئی باتوں کی راہ ہموار کر لی ہے۔

i- ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو قرآن میں زبردستی گھسانے کی راہ۔

ii- حضرت آدم علیہ السلام کی متعین ہستی ہونے کا انکار کرنے کی راہ۔

iii- ملائکہ کا ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہونے کا انکار کرنے کی راہ۔

iv- ابلیس کے لئے موجود فی الخارج ہستی ہونے کے انکار کی راہ۔

پرویز نے آدم، ملائکہ اور ابلیس کے جو معانی بتائے ہیں اور تخلیق انسانی سے متعلق آیات کا جو مطلب کیا ہے یہ حقائق چونکہ ایسے نہیں کہ مرور زمانہ سے جن کے معانی و مطالب بدل جائیں اس لئے اس بات کی تحقیق ناگزیر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے ان سے کیا سمجھا تھا۔ اگر انہوں نے کچھ اور سمجھا تھا اور اب پرویز نے کچھ اور بتایا ہے تو یہ الحاد فی الآیات ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا. (سورہ فُصِّلَتْ: 40)

جو لوگ ہماری آیتوں میں الحاد کرتے ہیں (یعنی ان کا مطلب بگاڑتے ہیں) وہ ہم پر مخفی

نہیں ہیں۔

آگے ہم قرآنی دلائل سے پرویز کی بات کے مخالف قرآن ہونے کو ذکر کرتے ہیں

### ڈارون کا نظریہ ارتقاء غیر قرآنی فکر ہے

1- تخلیق ایک تکوینی اور واقعاتی چیز ہے جو ایک خاص طریقے سے واقع ہوئی۔ اس

میں یہ احتمال ہی نہیں کہ اس سے ہٹ کر کسی اور صورت اور طریقے کو فرض کیا جاسکے۔ قرآن

پاک کی انہی آیات سے تیرہ چودہ صدیوں تک مسلمان کیا سمجھتے رہے۔ خود پرویز کے بقول

ہمارے ہاں جو عام تصور ہے کہ خدا نے پہلے پہل مٹی کا ایک پتلا بنایا اور اس میں روح پھونک کر

اسے انسانی شکل عطا کر دی۔“ اگر یہ تصور غلط تھا جیسا کہ پرویز نے لکھا کہ ”یہ تصور قرآنی نہیں

یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔“ تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا تو کم از کم یہ نظریہ نہ ہو

گا۔ ان کا دیا ہوا فکر ہم تک کیوں منتقل نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی لفظی و معنوی حفاظت کا

ذمہ لیا ہے پھر تیرہ چودہ صدیوں تک اس کی معنوی حفاظت کیوں نہیں ہوئی۔ معز لہ فرقہ بھی پیدا ہوا جو عقل کا علمبردار تھا اور حدیثوں پر عام طور سے اعتراض کرتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی انگلی پکڑ کر ان کو صحیح بات کیوں نہیں سمجھائی حالانکہ پرویز کا کہنا ہے کہ ”انسانی تخلیق کے متعلق قرآن کریم سے جو اشارات ملتے ہیں وہ ہماری فکر کا رخ نظریہ ارتقاء کی طرف ہی موڑتے ہیں۔“ (مطالب الفرقان ص 290 ج 1)

پھر جب ڈارون کا نظریہ ارتقاء سامنے آیا جس کی حیثیت محض ایک قیاس آرائی (Speculation) سے زیادہ نہیں اس وقت پرویز کے کہنے کے مطابق قرآن کی بات کی اصل حقیقت سمجھ میں آئی۔ اگر ڈارون یہ نظریہ پیش نہ کرتا تو شاید پرویز وغیرہ لوگ بھی اب تک غلط فکر میں مبتلا رہتے۔

2- پرویز کے بقول ”قرآن کریم سے جو اشارات ملتے ہیں وہ ہماری فکر کا رخ نظریہ ارتقاء ہی کی طرف موڑتے ہیں۔“

ڈاکٹر قمر زمان، محمد شیخ اور پرویز جیسے لوگوں کے بلند بانگ دعووں کے برعکس کہ قرآن خود ہی بیان ہے اور قرآن کے کسی بھی مقام کو سمجھنے کے لئے حدیث کی ضرورت نہیں یہاں پرویز خود اقرار کر رہے ہیں کہ اس موضوع سے متعلق صرف اشارات ہیں جن کو بیان قطعاً نہیں کہا جا سکتا۔ اب خدا کی طرف سے مزید بیان تو آنے سے رہا تو کیا یہ معقول طریقہ نہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دیے گئے بیان اور تعلیم کو تلاش کریں۔ آخر پرویز کی سمجھ کو قرآن نے ہمارے لئے حجت تو قرار نہیں دیا پھر ہم اسی کے پابند کیوں ہوں۔

3- ارتقاء کے مجوز ماہرین حیاتیات کے نزدیک حیات کی ابتداء وائرس (Virus) سے ہوئی ہے۔ وائرس کی دریافت سے پہلے امیبا (Amoeba) کو ابتدائی مظہر سمجھا جاتا تھا اور پرویز وغیرہ نے بھی اپنی طرف سے قرآنی آیات کو اسی پر منطبق کیا ہے لیکن بعد کی تحقیقات نے اس کی تعلیل کر دی اور اب وائرس کی سادہ تر ترکیب کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو یہ مقام دیا گیا ہے۔

پھر ماہرین حیاتیات کے نزدیک وائرس کا وجود مٹی، کچھ یا کھنکھاتی مٹی کا بھی محتاج نہیں ہے۔ ابتدائی گیس برق اور مادائے بنفشی (Ultraviolet) روشنی کی موجودگی سے متحد ہو کر

سادہ نامیاتی مرکبات میں تبدیل ہو گئی۔ جوں جوں زمین ٹھنڈی ہوتی گئی آبی بخارات جم کر تالاب، دریا اور سمندروں میں منتقل ہو گئے۔ سادہ نامیاتی مواد ان پانیوں میں لاکھوں سالوں میں جمع ہوتے گئے۔ اس پختی کے مرکبات کے بارے میں توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے میں عمل کر کے مختلف کیمیائی چیزیں بنائی ہوں گی۔ حیات کی ابتدائی صورتوں یعنی وائرس نے ان سمندروں کے نامیاتی مرکبات کو اپنی زندگی اور تناسل کے لئے استعمال کیا ہوگا۔

4- قرآن پاک میں ہے۔

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ.  
اور انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی نطفہ سے

بنایا۔

الانسان میں لام تعریف اگر جنس کا لیا جائے جیسا کہ پرویز کہتے ہیں تو مطلب یہ بنے گا کہ خدا نے جنس انسانی کی پیدائش گارے سے شروع کی پھر جنس انسان کی نسل کو نطفہ سے بنایا۔ یہ ترجمہ بالکل غلط اور عقل کے خلاف ہے کیونکہ جنس تو ایک عقلی مفہوم ہے اس کا گارے سے کیا تعلق اور اس کی نسل بھی نہیں ہوتی۔

اس آیت کا مطلب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب الانسان میں لام تعریف عہد کے لئے ہو اور اس سے مراد ایک شخص معین ہو جس کو خود تو گارے سے پیدا کیا گیا ہو پھر اس کی اولاد کو نطفہ سے پیدا کیا گیا ہو۔

5- يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (سورہ نساء: 1)

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دئے۔

مِنْهُمَا میں ضمیر سے مراد نفس واحدہ اور اس کا زوج ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دئے۔ پرویز کا کہنا ہے کہ نفس واحدہ سے مراد امیبا ہے اور اس کے زوج سے مراد آئندہ کسی مرحلہ میں عمل تقسیم سے پیدا ہونے والا مادہ خلیہ ہے۔ پرویز کی

یہ بات بالکل ہی غلط ہے کیونکہ ان دو سے تو مرد اور عورتیں نہیں بنائے گئے بلکہ ان سے تو محض کیکلیاتی یا کثیر الخلیاتی جاندار ہی بنائے گئے تھے۔

ہاں اگر نفس واحدہ سے آدم کے نام سے ایک متعین شخصیت مراد لی جائے اور ان سے اور ان کی زوجہ سے بہت مرد اور عورتیں پھیلانے تو مطلب صحیح بنتا ہے۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ کہنا کہ اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا حقیقت پر محمول ہوگا مجاز پر نہیں اور کلام کو حقیقت پر محمول کرنا جب کہ وہ ممکن ہو ضروری ہے۔

پرویز کی بات اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ نفس واحدہ سے اس کا جوڑا نکالا جب کہ پرویز کے مطابق نفس واحدہ سے جوڑا نہیں نکالا بلکہ پہلے نفس واحدہ کی تکثیر بغیر جوڑے کے ہوئی کیونکہ امیبا میں نر اور مادہ نہیں ہوتے۔ وہ تو ارتقاء کا خاصا حصہ گزرنے کے بعد نر و مادہ کی تمیز ہوئی۔ حیات کی ابتداء امیبا سے ماننے کے باوجود پھر بھی یہ کہنا کہ ایک جان سے اس کا جوڑا پیدا کیا گیا عقل سلیم اس کو قبول نہیں کرتی۔

6- پرویز کا سارا استدلال اور ان کی دلیل کا نقطہ ماسکہ اس تصور پر بھی پورا صادق آتا ہے جو آدم کے بارے میں تمام مسلمانوں میں چلا آیا ہے۔

تراب کا مطلب مٹی ہے۔ وہ بھی وہ جو منتخب کی ہوئی اور چنی ہوئی تھی۔ اس کا گارا بنایا گیا اور اس کو *مُسَلَّمَةٌ مِنْ طِينٍ* یعنی منتخب کردہ مٹی اور گارا کہا گیا۔ پھر اس گارے میں سڑاند پیدا ہوئی اور خمیر اٹھا جس کو *حَمَإٌ مَسْنُونٌ* اور *طِينٍ لَا زَبَّ* کہا گیا۔ پھر ہوا سے خشک ہو کر اور لو کی تپش سے پک کر کھنکھاتی مٹی بنی جس کو *صَلْصَالٍ* اور *كَالْفَخَّارِ* کہا گیا۔ پھر اس پر اور اطوار گزرے اور پھر اس قابل ہوئے کہ اس میں حیات پائی جائے۔ یہ مختلف مراحل کتنے عرصہ میں پورے ہوئے اس کی کسی نے بھی تحدید نہیں کی۔ ممکن ہے کہ اس کے ایک ایک مرحلہ میں ہزاروں سال گزرے ہوں اور ویسے تو اللہ تعالیٰ کو قدرت حاصل ہے کہ وہ سب کچھ ایک آن میں کر دیں۔ ہماری اس بات کے خلاف پرویز کے پاس کوئی قطعی اور پختہ قرآنی یا عقلی دلائل نہیں ہیں۔

غرض مذکورہ بالا تمام وجوہات سے معلوم ہوا کہ پرویز نے اس موضوع میں بھی قرآن و عقل دونوں کے اعتبار سے غلطی کی ہے۔ پرویز نے قرآن کے مطالعہ میں خود قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں کو توڑا ہے تو آخر کس وجہ سے پرویز کے فہم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

.....  
 حاصل یہ ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق تخلیق انسانی کو ماننا قرآن کے صریح خلاف ہے۔

### چھٹی غلطی: حضرت آدم کی متعین ہستی ہونے کا انکار کرنا

پرویز کہتے ہیں کہ ”آدم سے مراد کوئی خاص متعین فرد انسان نہیں بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے جب اس کے افراد نے قدیم انفرادی زندگی کی جگہ قدیم قبائل کی شکل میں پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی“۔

پرویز کی یہ بات مندرجہ ذیل وجوہ سے غلط ہے۔

1- انسانی تخلیق سے متعلق وہ تفصیل جو ابھی ہم نے ذکر کی۔

2- قرآن پاک میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ.

اس آیت کا ترجمہ جو پرویز نے کیا ہے وہ یہ ہے۔

”یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت

دی“۔

اس سے قطع نظر کہ آدم نبی تھے یا نہیں تھے یہ آیت اس بارے میں صریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو بھی ان کی ہم عصر قوم پر فضیلت دی اور یہی بات اس بارے میں قطعی دلیل ہے کہ آدم کے نام سے ایک متعین خاص شخص تھے کیونکہ اگر آدم سے پرویز کے کہے کے مطابق نوع انسانی لی جائے تو آیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ نوع کی ہم عصر قوم ماننا ایک فضول بات ہے۔

3- وَآتَىٰ آلَ عِصَىٰ نَبَأَ ابْنَىٰ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتَقَبَّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ

مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ

لَتَفْقُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لَأَقْتُلَنَّكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ إِنِّي أُرِيدُ

أَنْ تَبُوءَ بِلَايَمِي وَإِنَّمَا فَعَلْتُكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ فَطَوَّعَتْ

لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَفَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ

لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُورِى سَوْءَ أَخِيهِ قَالَ يَا وَيْلَتَىٰ أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرَابِ

.....

فَأَوْرِي سَوْءَةً أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ. (مائده: 27-31)

اور پڑھ ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر۔ جب دونوں نے کچھ نیاز دی تو قبول کی گئی ایک کی اور نہیں قبول کی گئی دوسرے کی۔ دوسرے نے (پہلے سے) کہا میں تجھے قتل کر دوں گا۔ پہلا بولا کہ اللہ محض قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے (اور اس کی نیاز قبول نہیں کرتا جو متعلقہ معاملہ میں خطا کار ہو) اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے گا تا کہ مجھے قتل کرے تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ تیری طرف بڑھانے والا نہیں۔ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تو لوٹے میرے گناہ کے ساتھ اور اپنے گناہ کے ساتھ پھر ہو جا تو آگ والوں میں سے اور یہی ظالموں کی جزا ہے۔ اور اس کو اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر راضی کیا پھر اس نے اس کو قتل کر دیا اور ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں سے۔ پھر بھیجا اللہ نے ایک کو جو کریدتا تھا زمین کو تا کہ اس (قاتل) کو دکھائے کہ کیسے وہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے۔ (یہ دیکھ کر) قاتل بولا ہائے افسوس مجھ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ میں اس کوے کی مثل ہی ہوتا کہ چھپاتا اپنے بھائی کی لاش کو پھر لگا بچھتا ہے۔

اس آیت میں ایک پورا حقیقی واقعہ ذکر ہے جس کو تمثیل اور ڈرامہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ کے دو کردار خاص متعین آدمی تھے جو خاص متعین شخص آدم کے بیٹے تھے اور اس بات کی دلیل کہ یہ آدم وہی پہلے انسان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے مٹی سے پیدا کیا تھا یہ ہے کہ جب ان میں سے ایک نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اب اس کو کچھ علم نہیں تھا کہ اپنے مقتول بھائی کی لاش کا کیا کرے۔ ایسی صورت حال اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس سے پہلے کسی انسان کے مرنے کا واقعہ پیش نہ آیا ہو۔ اگر قبائلی دور کے کسی دو آدمیوں کے درمیان ایسا واقعہ پیش آیا ہو تو قاتل کو یہ تو یقیناً پتہ ہوتا کہ مقتول کو کیسے ٹھکانے لگانا ہے۔

ساتویں غلطی: ملائکہ کا ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہونے کا انکار کرنا  
 پرویز لکھتے ہیں:

”قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو اجزائے ایمان میں سے قرار دیا ہے (مثلاً 2/285)  
 یعنی ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ، کتب، رسل، آخرت پر ایمان



لانے کے ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لائے۔ سوال یہ ہے کہ ملائکہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ کے متعلق وہ تصور رکھا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور انہیں وہی پوزیشن دی جائے جو قرآن نے ان کے لئے متعین کی ہے۔ ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہوں نے آدم کو سجدہ کیا (2/43) یعنی وہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ اور آدم سے مراد خود آدمی (یا نوع انسان) ہے لہذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنہیں انسان مسخر کر سکتا ہے۔ انہیں انسان کے سامنے جھکا ہوا رہنا چاہئے۔ کائنات کی جو قوتیں ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئیں انہیں چھوڑیے۔ جو قوتیں ہمارے علم میں آ چکی ہیں ان کے متعلق صحیح ایمان یہ ہوگا کہ ان سب کو انسان کے سامنے جھکنا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے کائناتی قوتیں نہیں جھکتیں وہ قوم (قرآن کی رو سے) صف آدمیت میں شمار ہونے کے بھی قابل نہیں چہ جائیکہ اسے جماعت مومنین کہا جائے۔

اب آپ سوچئے کہ جس قوم کے ایمان میں یہ چیز داخل تھی کہ کائناتی قوتوں کو آدمی کے سامنے جھکنا چاہئے وہ قوم اگر ان قوتوں کے سامنے جھکی ہوئی ہو (ان قوتوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان قوموں کے سامنے جنہوں نے ان قوتوں کو اپنے سامنے جھکایا ہوا ہے) تو اس قوم کی پستی کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے۔ یاد رکھئے مقام آدم یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور مقام مومن یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو مسخر کر کے ان کے حاصل کو قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کیا جائے۔ (لغات القرآن:

(244-245)

”جو لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان قوتوں کو طبعی قوتیں Physical Forces کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے لیکن انہیں ملائکہ کہنے یا کائناتی قوتیں حقیقت ایک ہی ہے۔ (لغات القرآن 242)

”ان قوتوں کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں (اختیار و ارادہ خدا کے بعد صرف انسان کو حاصل ہے) اس لئے یہ قوتیں بلا چون و چرا قانون خداوندی کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں۔“ (لغات القرآن 242)۔

## ہم کہتے ہیں

پرویز کے اس سارے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ ملائکہ سے مراد غیر ذی حیات، بے شعور، بے ارادہ اور اندھی و بہری کائناتی قوتیں ہیں۔ پرویز کی یہ بات قرآن کے صریح خلاف ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

1- وَلَٰكِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِٖٓ أَكْثَرُ غَافِلًا ۚ ذَٰلِكَ الَّذِي ذَرَأَهُ الْغَافِلِينَ ۚ

(بقرہ: 177)

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر۔

اس آیت میں بھی ملائکہ پر ایمان رکھنے کا ذکر ہے اور پرویز نے بھی لکھا ہے کہ ”قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو اجزائے ایمان میں سے قرار دیا ہے۔“ نیز اسی مذکورہ بالا آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ ”قرآن کی رو سے (یہ) پانچ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان مومن ہو جاتا ہے۔“

ان حقیقتوں پر ایمان لانا جیسا ہمارے لئے ضروری ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے لئے بھی ضروری تھا۔ اور یہ حقیقتیں تو دائمی ہیں جن کا مطلب زمانے کے گزرنے سے یا سائنسی تحقیقات میں اضافہ سے بدلنے والا نہیں۔ ملائکہ سے آج جو مراد ہے وہی رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی تھی اور وہی نوع انسانی کے تمدن کے ابتدائی دور میں تھی بلکہ اس سے بھی بہت پہلے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے ملائکہ سے کیا مراد لیا تھا۔ اگر انہوں نے بھی ان سے کائنات کی غیر ذی حیات بے شعور بے ارادہ اور اندھی بہری قوتیں مراد لی تھیں تو اس کی نقل کی کوئی دلیل ہونی چاہئے۔ ایسی کوئی دلیل نہ تو پرویز کے پاس ہے اور نہ ہی پرویز کے ہمواروں کے پاس ہے۔ اور اگر وہ ان سے ذی حیات، ذی شعور اور ذی ارادہ مخلوق مراد لیتے تھے تو پرویز اور ان کے ہمواروں کو کیا حق ہے کہ وہ ایک غیر متبدل حقیقت کا معنی محض اپنی عقل کی بنیاد پر بدل ڈالیں۔

2- قرآن پاک کی بہت سی آیات ملائکہ کے ذی حیات اور ذی شعور ہونے پر صاف

صاف دلالت کرتی ہیں۔

i- فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا. (آل عمران: 39)

پھر آواز دی زکریا کو فرشتوں نے جب کہ وہ حجرے کے اندر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تم کو خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی جو گواہی دے گا اللہ کے ایک حکم کی اور سردار ہوگا۔

ii- وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ. (بقرہ: 248)

اور کہا بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے کہ طاووت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق جس میں سیکنہ ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ اور ہارون کی اولاد اٹھالائیں گے اس کو فرشتے۔

iii- إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ. (سورہ احزاب: 56)

بلاشبہ اللہ نبی پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے نبی کیلئے دعائے رحمت کرتے ہیں۔

iv- فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ نَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا. (سورہ مریم: 17-19)

پھر کریم مریم نے اپنے لوگوں سے ورے پردہ۔ پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ جس نے مریم کے سامنے پورے آدمی کی شکل اختیار کر لی۔ مریم بولی میں رحمن کی پناہ لیتی ہوں تجھ سے اگر تو خدا خوفی کرنے والا ہے۔ وہ بولا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تجھ کو پاکیزہ لڑکا دوں۔

v- الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتٍ عَدْنٍ الَّتِي

وَعَذَّتْهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝  
وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.

(سورہ مومن: 9-7)

جو (فرشتے) اٹھا رہے ہیں عرش (الہی) کو اور جو اس کے گرد میں تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ اور اس پر یقین رکھتے ہیں اور بخشش طلب کرتے ہیں ایمان والوں کے لئے (ان الفاظ سے کہ) اے ہمارے رب تو رحمت اور علم سے ہر چیز پر حاوی ہے پس بخش دے ان لوگوں کو جو توبہ کرتے ہیں اور تیرے رستے کی پیروی کرتے ہیں اور ان کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ کے باغات میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور (اس کو بھی) جو کوئی نیک ہو ان کے باپوں میں اور ان کی بیویوں میں اور ان کی اولاد میں بے شک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔ اور بچا ان کو برائیوں سے اور یہی ہے بڑی کامیابی۔

vi- عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاطٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ.

(سورہ تحریم: 6)

جہنم کی آگ پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو تند خور اور زبردست ہیں جو اللہ ان کو حکم دیتا ہے اس میں اللہ کی (کچھ بھی) نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جو وہ حکم دے جاتے ہیں۔

حکم کی نافرمانی نہ کرنے پر تعریف اس وقت کی جاتی ہے جب ان میں نافرمانی کرنے کا ارادہ ہو سکتا ہو۔ تعریف کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ارادوں کو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے ہی میں فنا کیا ہوا ہے۔

vii- وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَّمَ فَمَا لَبِثَ

أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِئِدٍ فَلَمَّا رَآ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوطٍ. (ہود: 69,70)

اور آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر (اور) کہا (آپ پر)

.....  
 سلامتی ہو (ابراہیم نے بھی) کہا (تم پر بھی) سلام ہو۔ پھر دیرینہ کی کہ لے آیا ایک تلا ہوا بچھڑا۔  
 پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے کی طرف تو ان سے کھٹکا اور دل میں ان سے  
 خوف محسوس کیا وہ بولے آپ مت ڈریئے ہم کو لوط کی قوم کی طرف (عذاب دینے کیلئے) بھیجا  
 گیا ہے۔

viii- وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئَاءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ  
 عَصِيبٌ ۝ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ قَالَ يَقُومُ  
 هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزَوْنَ فِي ضَيْفِي أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ  
 رَشِيدٌ ۝ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَالَنَا فِي بَيْتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۝ قَالَ لَوْ  
 أَن لِي بِكُمْ قُوَّةٌ أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝ قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَن يَصِلُوا  
 إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْبِثْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرًا تَكُ إِنَّهُ مُصِيبُهَا  
 مَا أَصَابَهُمْ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ. (سورہ ہود 77-81).

اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس تو غمگین ہوا اور تنگدل ہوا ان کی وجہ  
 سے اور کہا آج بڑا سخت دن ہے۔ اور آئی لوط کے پاس ان کی قوم بے اختیار دوڑتی ہوئی اور وہ  
 (قوم کے لوگ) پہلے ہی سے برے کام کرتے تھے۔ لوط نے کہا اے میری قوم یہ میری بچیاں  
 (جو تمہارے نکاح میں ہیں یہ) پاک ہیں تمہارے لئے سو ڈرو اللہ سے اور مجھے میرے مہمانوں  
 میں مت رسوا کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی نیک چلن مرد نہیں ہے۔ قوم نے کہا کہ آپ جانتے ہیں  
 کہ ہمیں آپ کی بچیوں سے کچھ غرض نہیں ہے اور ہماری مراد تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ لوط نے  
 کہا کاش مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور حاصل ہوتا یا میں جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں۔ (اس وقت  
 مہمان) بولے اے لوط ہم تو آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں (اور ہم تک تو کیا) یہ آپ تک  
 بھی ہرگز نہیں پہنچ سکتے سوائے گھر والوں کو رات کے ایک حصہ میں لے چلے سوائے اپنی بیوی  
 کے کہ اس کو بھی وہی عذاب پہنچے جو اور قوم کو پہنچے گا۔ ان کے وعدہ کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح  
 قریب نہیں ہے۔

آٹھویں غلطی: ابلیس کا موجود فی الخارج ہستی ہونے کا انکار کرنا

پرویز کہتے ہیں:

”کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ کائنات کی کسی اور شے کو محصیت (قانون خداوندی کی خلاف ورزی) کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان، قانون خداوندی کی اطاعت سے سرکشی اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے یہ جذبات اسے (عالمگیر مفاد کلی کے مقابلہ میں) ذاتی مفاد پرستی پر ابھارتے ہیں اور وہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈال کر ان مفادات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر اس کی عقل اسے وہ طریقے بتاتی ہے جس سے وہ ان مفادات کو حاصل کر سکے۔ قرآن کریم نے ایسے جذبات اور ان کے بروئے کار لانے والے سامان و ذرائع (عقل حیلہ جو کے بتائے ہوئے طرق و حیل) کو ابلیس کہہ کر پکارا ہے اور اس کی سرکشی کی بنا پر اس کے متعلق کہا ہے کہ اس کی تخلیق آتش (نار) سے ہوئی ہے۔ اور چونکہ انسانی جذبات آنکھوں سے پنہاں ہوتے ہیں اور غیر محسوس طور پر مصروف عمل رہتے ہیں اس لئے كَآَنَ مِنَ الْجِنَّ کہا ہے (جن کے معنی ہیں چھپا ہوا)۔“ (لغات القرآن: 44-343)

پرویز کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ابلیس سے مراد مفاد کلی کے برخلاف ذاتی مفاد پر ابھارنے والے جذبات ہیں۔ لیکن اپنی کتاب مطالب الفرقان میں پرویز نے ابلیس سے مراد کو بالکل بدل دیا۔ لکھتے ہیں:

”انسان کو کچھ جذبات دئے گئے ہیں جن کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی زندگی برقرار رہتی ہے۔ تہذا ان جذبات کی تسکین خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ مادی تصور حیات کی رو سے ان تقاضوں کو (حیوانات کی طرح) جس طرح جی چاہے پورا کیا جاسکتا ہے لیکن قرآنی تصور حیات کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان تقاضوں کو ان پابندیوں کے دائرے کے اندر رہ کر پورا کیا جائے جنہیں مستقل اقدار خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً افزائش نسل کے لئے جنسی جذبات کی تسکین ضروری ہے۔ ایک شخص ان کی تسکین کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط کرتا ہے، دوسرا ان کی تسکین کسی پاک دامن شریف النفس لڑکی کی عصمت دری کے ذریعہ۔ جذبات کی تسکین دونوں صورتوں میں ہو جاتی ہے لیکن ایک طریق اپنے اندر خیر کا پہلو لئے ہوئے ہے

.....  
 اور دوسرا طریق شرک۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے جذبات کو سرکش اور بے باک نہ رکھو بلکہ ان کی تسکین اقدار خداوندی کی رہنمائی میں کرو..... یعنی قرآن کریم کی رو سے جذبات کی تسکین کوئی برا فعل نہیں۔ ہدایت خداوندی سے سرکشی برت کر ان کا پورا کرنا شر، جرم یا گناہ ہے۔ اسے اس نے شیطانی فعل کہہ کر پکارا ہے.....

قرآن کی رو سے شیطان یا ابلیس کوئی موجود فی الخارج ہستی یا شخصیت نہیں۔ یہ خود انسان کے اپنے ہی فیصلوں کا نام ہے (مطالب الفرقان: جس 51 ج 2)

اس جگہ جذبات تو ضرورت کی چیز بن گئے اور ابلیس سے مراد انسان کا وہ فیصلہ ہو گیا کہ جذبات کی تسکین وہ جائز طریقے سے کرے یا ناجائز طریقے سے کرے۔

ہم کہتے ہیں کہ ابلیس سے جذبات مراد لینا یا انسانی فیصلے مراد لینا دونوں ہی غلط ہیں کیونکہ:

1- جذبات تو غیر اختیاری قوت ہے جس کا اپنی حد سے بڑھ کر کسی قسم کی سرکشی کرنا متصور ہی نہیں ہے۔ رہا انسانی فیصلہ تو وہ انسانی فعل ہے جس پر انسان ماخوذ ہوتا ہے بس اتنا فرق ہے کہ زنا کا عزم و فیصلہ قلبی فعل ہے جب کہ خود زنا اعضاء و جوارح کا فعل ہے۔

2- پرویز نے خود کہا ہے کہ ”کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ کائنات کی کسی اور شے کو محصیت کا اختیار نہیں دیا گیا“۔

ابلیس سے مراد جذبات لیں یا ان کو بروئے کار لانے کے طریقے لیں یا انسانی فیصلے لیں ان میں سے کوئی بھی بذات خود انسان نہیں ہے لہذا ان میں سے کسی کو بھی محصیت کا اختیار نہیں جب کہ ابلیس کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ. (سورہ کہف: 50)  
 سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ تھا وہ جنوں میں سے اور اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

قرآن کی بات تو ظاہر ہے غلط نہیں ہو سکتی لہذا لامحالہ پرویز کی بات ہی غلط ہے۔

.....

3- ابلیس بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے اور مرور زمانہ سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی۔ اس وقت اس سے جو مراد ہے وہی مراد نبی ﷺ اور صحابہ کے دور میں بھی تھی۔ پرویز نے ابلیس سے جو مراد اس دور میں لی ہے کیا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے بھی یہی مراد لی تھی۔ اگر یہی تھی تو اس کی دلیل چاہئے اور اگر یہ نہیں تھی تو پرویز اور ان کے ہمواؤں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کے مفاہیم کو بدلیں۔

4- قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ. (سورہ ص: 76)  
ابلیس نے کہا میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پرویز نے نظریہ ارتقاء کے واسطہ میں سہی انسان کا مٹی سے پیدا ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اس آیت کے مطابق ابلیس نے آدم سے تقابل کرتے ہوئے کہا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا ہے جو حقیقت کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن قرآن کے برخلاف پرویز کہتے ہیں کہ اس کی تخلیق آگ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی سرکشی کی بنا پر (مجازاً) کہا ہے کہ اس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔

5- لَا مَلَأْتُ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ. (سورہ ص: 85)  
(اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کہا) میں ضرور بھروں گا جہنم کو تجھ سے اور ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے سب سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جہنم ایسی جگہ ہے جو انسانوں اور ابلیس سے بھری جائے گی پھر ابلیس سے اگر جذبات یا انسانی فیصلے مراد ہوں تو ان سے جہنم کو بھرنا بے معنی بات ہے کیونکہ یہ معنوی چیزیں ہیں جو کوئی جگہ نہیں گھیرتیں۔